

مجھے سچ کی دل

ہر ما کرہ اکثر آفتاب کی سکرین کی طرف متوجہ ہوئی ہو
اس کے حد درجہ استفراق پر مسکراتی نگاہوں سے اسے
اندراجے کا اشارہ کر رہی تھی۔

حیدر بھائی اب سے پندرہ منٹ پیشتر اسے ہاسپٹل
کے گیٹ پر ڈراپ کر گئے تھے۔ سڑک کے عین
کنارے پر اسے بوسہ دیا تھا جس پر اس نے انظار میں
ڈاکٹر آفتاب فاؤنڈیشن تحریر تھا۔ دور سے ہی دیکھنے
والوں کو متوجہ کرتا تھا۔

گیٹ پر باوردی چوکیدار مستعد بیٹھا تھا۔ حوریہ پہلی
بار پھوپھو کو دیکھنے ہاسپٹل آئی تھی۔ جو دن پہلے
ایڈمٹ ہوئی تھیں۔

ہاسپٹل میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اسے
صورت اور لباس کی نظر پڑی۔ اس نے اسے دیکھا اور اس
سے ہوا۔

”زہرا بیگم کون سے روم میں ہیں؟“ وہ دن پہلے
ایڈمٹ ہوئی ہیں، ہارٹ پشٹنٹ ہیں۔“ لڑکی کی
سوالیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے تفصیل بتائی تو

زندگی سے ڈرتے ہو

زندگی تو تم بھی ہو

زندگی تو ہم بھی ہیں

آدمی سے ڈرتے ہو

آدمی تو تم بھی ہو

آدمی تو ہم بھی ہیں

آدمی زباں بھی ہے

آدمی بیاں بھی ہے

اس سے تم نہیں ڈرتے

حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے

آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ

اس سے تم نہیں ڈرتے

جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو

اس گھڑی کی آمد کی آنکھ سے ڈرتے ہو

”میڈم! ڈاکٹر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔“ وہ



”جب ماں جی کو یہاں لایا گیا تو ان کے دل کا ایک والو بند تھا۔ بلند پریشہ بہت بائی تھا اور گردوں میں پتھری بھی تھی اور اب آج کے ٹیسٹ دیکھیں۔ سب کچھ کلیئر ہے لیکن نارمل سے گردوں میں پتھری بھی نہیں ہے اور دل کا ڈاؤن فیئر آپریشن ہم نے کھول دیا ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہوا ہے۔ ماں جی اب خطرے سے باہر ہیں۔“

”ڈاکٹر صاحب! یہ سب آپ کے ہاتھ کی شفا ہے اور ہم بڑے خوش قسمت ہیں جو بروقت انی جان کو لے آئے آپ کے پاس۔“

حیدر بھائی بہت ہی شکر گزار نظروں سے ڈاکٹر آفتاب کو دیکھ رہے تھے۔

”یہ سب اوپر والے کا کمال ہے ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ آج تک اس ہسپتال میں آنے والا کوئی بھی مریض بغیر صحت یاب ہوئے واپس نہیں گیا یہ سب اللہ کی مہربانی کے طفیل ہے۔“

ڈاکٹر آفتاب دھیرے دھیرے بول رہے تھے اور لگ ہی نہیں رہا تھا یہ شخص جو اپنی عاجزی اور خاکساری کا نمونہ ہے اتنا بڑا ڈاکٹر ہے۔ وہ سب متاثر تھے واپس یہ بھی گاڑی میں ڈاکٹر آفتاب کی نئی باتیں ہوتی رہیں ان کی قابلیت کے کمن گئے جاتے رہے وہ واقعی تھے بھی ایسے غرور تو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔

زہرا بیگم بتا رہی تھیں کہ مستحق اور ناوار مریضوں کے علاج کا خرچ ڈاکٹر آفتاب فاؤنڈیشن ستر فیصد خود برداشت کرتی ہے۔

”فرشتہ ہے فرشتہ ڈاکٹر آفتاب انسان کے روپ میں۔ نرسیں تو اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتیں اور عام مریضوں کا بھی یہی حال ہے۔ اتوار تو کیا عید تک کے دن بھی چھٹی نہیں کرتا۔ صبح نو بجے آتا ہے اور رات بارہ کے بعد جاتا ہے اور اگر کوئی ایمر جنسی ہو جائے تو رات کو خود آجاتا ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی اس نیک انسان پہ ترس آتا ہے۔“

زہرا بیگم بات کرتے کرتے خاموش ہو گئیں تو حیدر اضطرابی انداز میں بول پڑا۔

”کیوں؟“ وہ خود ڈاکٹر آفتاب سے مل کر بہت متاثر

ہوا تھا۔

”اسے اپنی گھریلو زندگی میں سکون میسر نہیں ہے مجھے تو بالکل اپنی ماں کی طرح عزت دی ہے اس نے، اس لیے اپنی زندگی کے بارے میں بھی بتایا۔ بس ایسے ہی نیک لوگوں کو اللہ امتحان کے لیے پختا ہے۔“

مہر واپس آتے ہی عزیز و اقارب زہرا بیگم کی عیادت کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ حور یہ کاون بہت مصروف نظر آتا تھا۔ پھوپھو کو وقت پہ دوانی تھا اس کی ذمہ داری تھی۔ ان کے لیے پرہیزی کھانا بھی وہ خود بناتی۔ عافیہ کے سر سے یہ بوجھ کم ہوا تو اس نے بھی سکون کی سانس لی۔

حور یہ نے اپنا بستر چھو پھو کے کمرے میں ہی سیٹ کر لیا تھا کہ رات کو کسی بھی وقت انہیں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

پھوپھو کی بیماری اسے اندر ہی اندر پریشان کر رہی تھی۔ ڈاکٹر آفتاب نے ایک ماہ کے بعد دوبارہ چیک اپ کے لیے بلوایا تھا۔ پھوپھو کے ساتھ حور یہ عافیہ بھانجی بھی تھیں۔

حیدر بھائی انہیں ڈرا کر دیکھنے چلے گئے۔

ڈاکٹر آفتاب نے بڑی شائستگی سے ان دونوں کا حوالہ پوچھا۔

”آپ نے ان کا بہت خیال رکھا ہے۔“ ان کا مخاطب عافیہ اور حور یہ تھیں۔

”یہ ہی تو میرا خیال رکھتی ہے اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔ مجھے اس کی بہت فکر ہے۔ یہ میرے جیتے جی اپنے گھر کی ہو جائے تو سکون سے مر سکوں گی۔“

بہت پیار سے حور یہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”یہ آپ کی کیا گفتی ہیں؟“ زہرا بیگم کے انداز نے ڈاکٹر آفتاب کو حور یہ میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔

”میرے بھائی کی اکلوتی نشانی ہے۔ ماں پیدا ہوتے ساتھ ہی مر گئی تھی۔ باپ زمینوں کے جھگڑے میں مار گیا۔ اس بد نصیب کا میرے سوا کوئی نہیں ہے۔“

”کہو کہ اس کا نصیب اچھا ہو۔“ زہرا بیگم کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”ماں جی! آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ اللہ ان کی قسمت اچھی کرے گا۔ آپ جیسی نیک خاتون کے ہمارے میں انہوں نے پرورش پائی ہے تو یہ کیسی ہوں گی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دشواری نہیں ہے۔“

ڈاکٹر آفتاب کا انداز اتنا پراثر تھا کہ حور یہ یک ٹک دیکھتی رہ گئی۔

”میرے پاس ہر طرح کے لوگ علاج کے لیے آتے ہیں۔ ایک بار ایک پریشان حال خاتون نے مجھ سے اپنی بیٹی کے سلسلے میں پریشانی کا اظہار کیا۔ انہوں نے نہ جانے کیوں مجھ سے اتنی امیدیں وابستہ کر لیں کہ کہنے لگیں ڈاکٹر صاحب اللہ کے بعد آپ ہی ہمارا بھائی ہیں۔ خیر اس بچی کا رشتہ بہت اچھے گھرانے میں ہوا اس کے لیے وسیلہ اللہ نے مجھ گناہ گار کو بنایا۔ آج وہ خاتون مجھے دعائیں دیتی ہیں۔ میں نے ایک این جی او بنائی ہے۔ ایک شہلانو باؤس بھی ہے بے سہارا عورتوں اور یتیم بچوں کے لیے۔ ایک دلفیئر ٹرسٹ بھی ہے جس نے کل متعین کیا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کو انسانی فائدے کی خاطر وقف کر دیا ہے اور اللہ نے میری زندگی میں آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ مجھے دوسروں کے کام آکر خوشی ملتی ہے۔“

”میں! اللہ تمہیں خوش رکھے، لمبی زندگی دے۔ میرے دل سے تو دعا ہی نکلتی ہے۔“ زہرا بیگم کا لہجہ بے ریا اور پر خلوص تھا۔

”بس مجھے دعائیں ہی چاہئیں میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے بس صرف یہ۔“ ڈاکٹر آفتاب ایک دم سے سنجیدہ ہو گئے مگر پھر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور زہرا بیگم کو کچھ مزید ٹیسٹ کروانے بھیج دیا۔

زہرا بیگم اور حور یہ کی غیر موجودگی میں عافیہ ڈاکٹر آفتاب سے باتیں کرتی رہی۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں کیرید کیرید کر پوچھا۔ انہوں نے خوش دلی سے ہر سوال کا جواب دیا۔ جب زہرا بیگم ٹیسٹ کروا کر فارغ ہوئیں عافیہ ڈاکٹر آفتاب سے ان کا پرسنل نمبر لے کر اپنے موبائل فون میں محفوظ کر چکی تھی۔

مشافعتنا

بہنوں کا اپنا ہفت روزہ

جولائی 2010 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

جولائی 2010 کے شمارے کی ایک جھلک

”اداکارو“ ”جھن کاظم“ سے ملاقات،

”جنوب عشق“ نازیہ مغل کا مکمل ڈاول،

”موج مغل نے دست دی“ متعلقہ تلاش کا مکمل ڈاول،

”ہم یہ چاہیں کہ تو چاہے ہمیں“ شازیہ مصطفیٰ کا ڈاول،

”اس کا جنوں میں“ سندس جیس کا ڈاول،

ان کے علاوہ کنول ریاض، تحسین اختر، بشیرہ ناز،

شہلا امراج اور حشر شش کے افسانے،

”پیا سادشت“ فرحت شاکت کا سلسلہ وار ڈاول،

”میرے ساتھ سے تیرا“ ام مریم کا سلسلہ وار ڈاول،

میں بھی حلاوت

پیارے نیر مجاہد کی باتیں، اللہ عا۔۔۔ انگریز، شہزادہ کا دنیا کی دلچسپ قصوات کے علاوہ حنا کے بھی مستقل سلسلے شام ہیں

جولائی 2010 کا شمارہ

آج ہی اپنے قریبی ایک اسٹال سے طلب کر لیں

زہرا بیگم اپنے زیورات نکال کر بیٹھی ہوئی تھیں۔
کھلے دروازے سے عافیہ نے اندر جھانکا تو وہ بھی ادھر
نی آئی۔

”آئی! کیا کر رہی ہیں یہ سونے کی زیور کیوں نکالے
جوئے ہیں؟“ اس کی نگاہیں جزاؤ میٹ پر جمی تھیں۔
”بس بیٹا! نکال کر دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی ہوں،
پالش کروالوں۔“ انہوں نے مصروف سے انداز میں
کہا تو عافیہ کو جھٹس سا ہوا۔

”پالش کیوں کروانا ہے آئی؟“
”حنان کی دلہن کے لیے نکال کر رکھے ہیں بیٹھی ہے
ایک سیٹ چڑھاؤں کی یہ والا کیسا ہے؟“
انہوں نے معصومانہ اشتیاق سے جزاؤ میٹ کی
بلطف اشارہ کیا مگر عافیہ اس وقت اپنے آپ میں نہیں
تھی۔ متنی دلہن سیٹ اس کے ذہن میں گنڈھ ہو
رہے تھے۔

”حنان کے لیے لڑکی ڈھونڈنی ہے آپ نے؟“ اس
نے اپنی اندرونی حالت پہ قابو پا کر بظاہر مسکراتے
ہوئے پوچھا۔
”لوئی گماں ڈھونڈنی ہے۔ گھر میں ہی ہے۔“
”گھر میں؟“

”ہاں اپنی حوریہ کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ اپنے
آپ میں مگن تھیں ورنہ عافیہ کے ناگوار تاثرات
انہیں ضرور چونکا تے۔
”مگر آئی! حوریہ حنان سے بڑی ہے اور پھر نو عمری
لیں اس کے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے۔ مجھے تو یہ رشتہ بے
جوڑ لگ رہا ہے۔ حنان کو ایک سے ایک کم عمر خوب
مورت لڑکی مل سکتی ہے۔“

اس نے دل کی بات کہہ ڈالی جو زہرا بیگم کو اچھی
نہیں لگی۔
”تین چار سال کی چھوٹی بڑائی کوئی اہمیت نہیں
رکھتی پھر حوریہ دیکھنے میں کسی طرح بھی حنان سے
بڑی نہیں لگتی۔ اور جو حادثہ اس کے ساتھ ہوا یہ ایسی

یاد رکھنے والی بات بھی نہیں ہے اور پھر اس بات کو اب
تین چار سال گزر چکے ہیں۔“
زہرا بیگم اس کے اعتراض کو خاطر میں نہیں لائی
تھیں۔ پھر بھی عافیہ نے ایک اور کوشش کی۔
”آپ نے حنان سے پوچھا ہے؟“

”اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اسے پہ
دوں گی وہ انکار نہیں کرے گا۔ پھر انکار کرنے کی کوئی
وجہ بھی نہیں ہے۔ حنان خوش قسمت ہو گا جو حوریہ
جیسی لڑکی اس کی بیوی بنے گی۔“ ان کے لہجے میں
محبت ہی محبت تھی۔

عافیہ برا سامنہ بنا کر ان کے پاس سے اٹھ آئی۔ اس
نے سب سے پہلے اپنے میکے فون کر کے یہ بات بتائی۔
نشا کا تو برا حال تھا۔ عافیہ نے باتیں کر کر کے چھینر چھینر
کر اسے خوابوں کی دواوی میں پہنچا دیا تھا۔ وہ حنان پر اپنا
حق سمجھتی تھی۔ عافیہ کا شروع سے ہی ارادہ تھا کہ اس
گھر میں دیورانی بن کر نشا شاہی آئے گی۔ کیونکہ حنان
بست ذہین اسٹوڈنٹ تھا۔ عافیہ آٹھ سال پہلے اس گھر
میں حیدر کی دلہن بن کر آئی تھی تب سے حنان
رکاس لیم کی امتیازی بیویوں کے ساتھ پاس پور رہا تھا۔
ایف ایس سی کے بعد اس نے اپنے لیے انجینئرنگ
لاؤن چنی۔

انجینئرنگ مکمل کرنے کے بعد اس کو بہت اچھی
جاب مل گئی تھی دیگر سہولیات اس کے علاوہ تھیں۔
وہ تو اور ہی خواب دیکھ رہی تھی مگر زہرا بیگم نے
حقیقت کا سامنا کرنا دیا تھا۔
نشا نے دو ماہ پہلے ہی گریجویشن کا امتحان دیا تھا۔
عافیہ کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی رزلٹ آوٹ ہو وہ حیدر سے
نشا اور حنان کے رشتے کی بات کرے اور وہ پھر اس کی
خواہش کو زہرا بیگم تک پہنچائے۔

عافیہ کو امید تھی زہرا بیگم انکار نہیں کریں گی پھر
حنان کی بھی کسی بات سے آج تک نشا کے بارے
میں کوئی ناپسندیدگی عیاں نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ نشا
آمد سے وہ خوش ہوتا اس کی شگفتہ مزاحی اور بڑا
سنجی اسے پسند تھی۔

جواب اچانک زہرا بیگم حوریہ کو درمیان میں لے
لی تھیں۔

”حوریہ نے زہرا بیگم کو کھانے کے بعد دوا بھی کھلا
دی تھی۔ وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی تو انہوں نے
دوبارہ آواز دے ڈالی۔ وہ جائے نماز رکھ کر ان کے پاس
چلی آئی۔“

”جی پھوپھو! کیا بات ہے؟“
جواباً انہوں نے اسے پاس بٹھایا اور اس کا دایاں
ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پیار سے چومایا۔ ان کی
آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ تڑپ ہی تو تھی۔
”پھوپھو! کیوں رو رہی ہیں؟“ اس نے اپنے ہاتھوں
کے پالے میں ان کا چہرہ اٹھام لیا۔
”یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ آج میرا بھائی، میرا
شجاعت زندہ ہوا تو میں اس کے پاس نہیں مانگنے
جانی۔ پوری چاؤ اور مان کے ساتھ۔ میں نے فیصلہ کیا
ہے کہ میں حنان کی دلہن بنا کر ہمیشہ کے لیے اپنے
گھر میں رہوں۔“

حوریہ پری طرح زبردست ہو گئی۔ ایک دم سے پھوپھو
نے غیر متوقع بات کی تھی وہ خیر ہسٹ اور شرم کے ملے
جلے تاثرات کا شکار تھی۔ پھر اس سے پھوپھو کے پاس
مزید بیٹھا نہیں گیا، اٹھ کر ٹیسرے پے آگئی۔ اسے پھوپھو
سے بہت شرم آ رہی تھی۔
اس کے جانے کے بعد زہرا بیگم نے حنان کو بلوایا۔
اور اس سے بھی یہی بات کی۔

”میں پہلے اپنی خواہش کو دل میں دبائے رہی کہ تم
پڑھ رہے ہو پھر تمہاری نوکری کا انتظار تھا۔ اب تم دو
سال سے برسرِ روزگار ہو، اچھا کما رہے ہو۔ حوریہ
تمہارے سامنے ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے امید
ہے وہ تمہاری زندگی کو سنوار دے گی۔“ ساتھ ہی وہ
حنان کے تاثرات بھی دیکھ رہی تھیں۔
”ٹھیک ہے امی! جو آپ کی مرضی۔“ حنان خاصی

دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ زہرا بیگم نے اس کا ہاتھ
چوم لیا۔
”ٹھیک ہے۔ اگلے ہفتہ کو متنی کی رسی سی تقریب
کر لیتی ہوں۔ تم اپنے قریبی دوستوں کو بلا لیتا۔ میں
نہیں چاہتی کہ حوریہ کے دل میں کوئی ارمان باقی رہے۔
اس کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر شادی بھی کر لیں
گے۔“ زہرا بیگم اپنا پردہ گرام تار ہی تھیں۔
صبح انہوں نے عافیہ کو بھی اپنے پردہ گرام کے بارے
میں بتادیا۔

”حوریہ کو بازار لے جانا۔ وہ متنی کا جوڑا اور دیگر
چیزیں اپنی پسند سے خرید لے گی۔ ساتھ ہی لسٹ بناؤ
کہ کون کون لوگوں کو بلانا ہے متنی میں۔“ وہ اس کے
دل کی حالت سے بے خبر تار ہی تھیں اور عافیہ کے منہ
سے کوئی لفظ ہی نہیں نکل رہا تھا۔

انسان جو سوچتا ہے ضروری نہیں کہ وہی ہو۔
زہرا بیگم جو حوریہ اور حنان کی متنی کے انتظام کرنے
میں مصروف تھیں۔ رات کو اچانک بلند پریشانی ہو
جانے لگی۔ ہسپتال میں ایڈمٹ ہو گئیں۔ حیدر اور
حنان انہیں امیر جنسی میں قریبی ہسپتال میں لے گئے۔
عمر تب تک دیر ہو گئی تھی۔ زہرا بیگم کو برین ڈیمبرج
ہوا تھا اور جسم کا بایاں حصہ حیرالانز ہو چکا تھا۔

اسی پوزیشن میں دس دن رہنے کے بعد وہ بڑی
خاموشی سے خالق حقیقی سے جا ملیں۔
بائی گھروالوں کا جو حال تھا وہ سوچتا ہر حوریہ پہ گزر
رہی تھی۔ وہی جانتی تھی۔ ابو کے قتل کے بعد آج
سے ساڑھے سات سال پہلے اسے جھوکس سے شہر اپنے
پاس لانے والی پھوپھو زہرا بیگم تھیں۔ انہوں نے کسی
موقع پر بھی اسے تنہائی یا اکیلے پن کا احساس نہیں
ہونے دیا تھا۔ اسے بالکل سنگی بیٹیوں کی طرح محبت دی
’خود ان کی اپنی کوئی بیٹی تو تھی نہیں یہ خلا حوریہ کے وجود
سے بھرتی ہو گیا تھا۔

حیدر بھائی حوریہ سے ڈیڑھ سال بڑے تھے جبکہ

حنان اس سے تین ساڑھے تین سال چھوٹا تھا۔ وہ شروع سے ہی کتابی گیزر تھا۔ کالج اور یونیورسٹی سے گھر آنے کے بعد دوستوں اور پڑھائی میں مصروف ہو جاتا۔ حیدر بھائی، حوریہ کو بہنوں کی طرح ہی چاہتے تھے۔ مگر ان کی دور شادی کے بعد غانیہ کے ہاتھ میں تھی۔ سو حوریہ کو شروع سے ہی ان کی مجبوری کا اندازہ تھا۔

حنان کی اپنی دنیا تھی مگر اس کے باوجود حوریہ کے وجود سے لاعلم نہیں تھا۔ امی کی فکر کرتی، گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف اپنی اس بے ضرر سی کزن سے حنان کو ہمدردی تھی پھر امی بھی اسے بہت چاہتی تھیں۔ اسے اپنے گھر لانے کے بعد انہوں نے سوچ لیا تھا کہ حوریہ کو اپنی بیوی بنانا ہے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار انہوں نے کسی کے سامنے نہیں کیا تھا کہ مبارک وہ یہ بات کر دیں اور کل حنان وقت آنے پہ بدل جائے تو حوریہ کا دل برا ہو۔

اپنے خوابوں اور خواہشوں کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی قضائے آریو چاکہ سب خواب ہی بکھر رہے تھے۔

چھوٹو کی وفات کو تین ماہ گزر چکے تھے اور حنان بہت چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ حوریہ کا دل جانے کیوں کٹ سا جاتا تھا۔ شاید زہرا بیگم کی وفات کا سب سے زیادہ اثر اسی نے لیا تھا۔ ان کی موت کے بعد گھر کی زندگی آہستہ آہستہ معمول پہ آگئی تھی مگر حنان کی خاموشی نوٹ کر ہی نہیں دے رہی تھی۔

رات کا کھانا کھایا جا رہا تھا۔ ساتھ باتیں بھی ہو رہی تھیں باتوں کے دوران غانیہ نے حنان سے کہا کہ کل وہ بھی ساتھ چلے اور منتہی کا جوڑا خود پسند کرے۔ حوریہ کے چہرے پر رنگ آگیا۔ حنان کی نظر لڑا اور اس کی طرف اٹھی تھی۔

”مٹاشا کو تم خود ہی پک کر لیتا۔ جس نے استعمال

کرنا ہے پہننا ہے اس کی رضامندی بھی لازمی ہے۔“ ویسے بھی مٹاشا اپنی پسند و ناپسند کے معاملے میں بہت حساس ہے۔“

غانیہ سراسر حوریہ کو سنارہی تھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس سارے قصے میں مٹاشا کیا ذکر ہے اور جب سمجھ میں آیا تو اسے اندر دلی اندیشہ پہ قابو پانا مشکل ہو گیا۔ وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

غانیہ کی طنزیہ نگاہوں نے اس کے جاتے نہ دیا۔ پچھلایا۔ حنان سر تھکائے پوری طرح کھانے کی طرف متوجہ تھا۔

درد ہوتے ہیں کہیں دل میں چھپانے کے لیے سب کے سب آنسو نہیں ہوتے مہانے کے لیے

کوئی غم ہو کوئی دکھ ہو درد کوئی ہو مسکراتا پڑا ہی جاتا ہے زمانے کے لیے لانگہ اس کی سب سے قریبی دوست اس کی غم انگیز اس وقت اگر اس کا دیکھ نہ جائی تو وہ بری طرح بکھر جاتی۔

”اپنے آپ کو سنبھالو پلیز اس میں اوپر والے کی کوئی مصلحت ہوگی۔ تم خود کو سنبھالو اور ان کی خوشیوں میں شریک ہو۔ اچھا ہوا جو تمہارے کزن کی ناپسندیدگی پہلے ہی ظاہر ہو گئی ورنہ بعد میں تم کیا کرتیں۔؟“ غنہ نے تمہارے نصیب میں جو خوشیاں لکھی ہیں وہ تمہیں مل کر رہیں گی، تمہارا ایمان اتنا مضبوط تھا تقدیر اور جزا سزا کے فلسفے پہ۔ پھر یہ ناامیدی، یہ ناشکری کیا معنی رکھتی ہے؟“

لانگہ نے اس کے دیکھتے دل پہ تسلی کا مرہم کیا رہا کہ اس کے بچے آنسو تھمنے لگے۔

لانگہ سے اس کی دوستی دس گیارہ سال پرانی تھی۔ وہ چوہدری شیرداد کی بیٹی تھی۔ ابو کے بہت قریبی دوست کی بیٹی۔ ایک بار گاؤں کی سیر کے لیے آئی تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صاف دل اور معصوم سی حوریہ کی

گھر پر ہو کر رہ گئی۔ وہ بیاہ کر اپنے شوہر کے ساتھ فرانس چلی گئی تھی مگر ان دنوں کی دوستی اور محبت میں یہ بددلی اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ لانگہ اب بھی اسے فون کرتی۔ اس کی دوستی پہ حوریہ کو بہت ناز تھا۔ ہر پریشانی میں وہ اسے سب سے پہلے یاد آتی۔ یہ اسی محبت کا کرشمہ تھا کہ اس نے حوریہ کی روٹی روٹی آواز کو اتنے دور بیٹھے ہوئے بھی محسوس کر لیا تھا۔ حوریہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سب بتانا پڑا۔ لانگہ اس کے دکھ پہ اداس بھی مگر اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

بھوپھو نے اسے بے پناہ محبت دی تھی۔ یہ ان کی محبت کی انتہا تھی کہ وہ اسے بیٹا کر گھر میں رکھنا چاہتی تھیں۔ اسے حنان سے کوئی فلمی یا افسانوی قسم کی محبت تو نہیں تھی مگر بھوپھو کی خواہش کے اظہار کے بعد اس کے دل میں بھی چاہت کے انہی خود رو پودے نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ صد شکر کہ وہ تناور درخت نہیں بنا تھا مگر اذیت تو ہوتی ہے۔ ٹھکرائے جانے کی

تکڑا کر اور وہ بھی اذیت سے گزر رہی تھی۔

حیدر، بیوی کے سامنے ایک لفظ نہیں بول سکا اور حنان کی منتہی بڑی دھوم دھام کے ساتھ مٹاشا کے ساتھ ہو گئی۔ اسے بھی اپنی ماں کی خواہش کا علم تھا۔ انجان تو حنان بھی نہیں تھا۔ مگر غانیہ نے اس کے سامنے حوریہ کی گزشتہ زندگی کی نحوست کی ایسی تصویر کشی کی، اس کی اور حوریہ کی عمر کے معمول سے فرق کو بولیں بڑھا چڑھا کر خامی میں بدلا کہ حنان کو اپنی راہ نجات مٹاشا کی صورت میں نظر آنے لگی۔

مٹاشا تھی بھی خوب صورت، طرح دار، شیخ مزاج اور کم عمر۔ اس پر حنان کو متوجہ کرنے کی کوششیں اور وہ اپنا دامن بچا بھی نہیں پایا۔

دو دنوں طرف سے شادی کی شایگ غانیہ ہی کر رہی تھی۔ اس نے حوریہ سے کسی قسم کی معذرت کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اور یہ سب کتنا تکلیف دہ

تھا اس نے کیسے وہی جانتی تھی۔

ڈاکٹر آفتاب، حیدر اور غانیہ کے پاس زہرا بیگم کی تعزیت کرنے آئے تھے۔ غانیہ اور حیدر بہت خوش تھے کہ ڈاکٹر آفتاب ان کے گھر آئے ہیں۔ حوریہ اپنے کمرے میں لیٹی تھی ڈرائنگ روم سے آوازیں آرہی تھیں مگر وہ اٹھ کر نہیں گئی۔

اگلے روز غانیہ کے سر میں شدید درد تھا۔ وہ سیدھی ڈاکٹر آفتاب کے پاس پہنچ گئی۔

حیرت انگیز طور پہ کچھ دیر بعد ہی اس کے سر کا درد کم ہوتے ہوئے ختم ہو گیا۔ احتیاطاً ڈاکٹر آفتاب نے اس کے کچھ ٹیسٹ لیے۔ رپورٹ دیکھ کر ان کے چہرے پہ پریشانی آگئی۔

”آپ کا دل کچھ ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے اور میٹرین بھی ہے۔ لیکن یہ میں اپنے کلینک سے ہی کچھ میڈیسن دے رہا ہوں یہ آپ نے ایک ماہ کھانے کے بعد دوبارہ آنا ہے میرے پاس۔ نئے سرے سے آپ کے ٹیسٹ ہوں گے۔ پھر دیکھیں گے۔ آپ کتنا امپرور لگتی ہیں۔ آپ کے گھر میں جو ماں جی کے بھائی کی بیٹی رہتی تھی وہ کیسی ہے؟“

انہوں نے اچانک حوریہ کے بارے میں پوچھ لیا۔ یہ تو غانیہ کا پسندیدہ موضوع تھا جس پہ وہ گفتگوں بول سکتی تھی۔

”بس نہ پوچھیں۔ ہم سب بہت پریشان ہیں اس کے بارے میں۔ میری تو نیند ہی اڑی ہوئی ہے اس کی وجہ سے۔ کوئی اچھا رشتہ ملے تو شادی کر دیں اس کی۔ آئی بھی جب تک زندہ رہیں، اسی کی فکر میں ٹھکتی رہیں۔ اب ہمارا بھی یہی حال ہے۔“ اس نے دنیا بھر کا درد لے میں سمولیا تھا۔

”کیوں اتنی فکر کرتی ہیں، اچھے گھر لانے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کو جلد یا بدیر اچھے رشتے مل ہی جاتے ہیں۔“

”بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر لڑکے والوں کے

اس کا ارادہ تھا وہ حیدر کو آرام دے تاکہ اس کی گھر میں کی فوج نہیں آئی۔ دوسرے روز ڈاکٹر آفتاب خبردار کے گھر پہنچ گئے۔

حیدر اور حنا دونوں ہی گھر پہنچے تھے۔
ڈاکٹر آفتاب اکیلے ہی آئے تھے۔

جب انہوں نے مدعا بیان کیا تو حیدر چند منیہ کے لیے حیران سا ہو گیا مگر عافیہ کی نگاہوں نے خاموش رہنے کا پیغام دیا تو وہ ڈھیلا سا رہ گیا۔

عافیہ مسلسل بول رہی تھی۔ ڈاکٹر آفتاب نے اپنا لائف ہسٹری کھول کر ان کے سامنے رکھ دی۔

”میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابھی میٹرک میں ہی تھا کہ گھر والوں نے مجھ سے پندرہ سال بڑی کزن سے رشتہ طے کر دیا۔ خیر خاندان وانوں کی عزت کی خاطر میں نے سر جھٹکا دیا۔ پھر آرمی میں کمیشن مل گیا۔ میں نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ اس سلسلے میں میں نے امریکہ، فرانس اور اٹلی کا سفر بھی کیا۔ میری خدمات کے سلسلے میں امریکہ نے مجھے اعزاز دی وکٹری دی۔ میں نے بہت عرصہ سعودیہ اور دبئی میں بھی کام کیا۔

انڈی نے بہت عزت اور شہرت دی۔ قریب الگ ملک میں بھی میرے پاس آکر ٹھیک ہو جاتے۔ میرے پاس محنت کی جو کمائی تھی اس سے میں نے یہ ہاسپٹل اور بے سارا عورتوں بچوں کے لیے ایک ادارہ قائم کر دیا۔

لیکن میری گھریلو زندگی بہت ڈسٹرب رہی۔ تین بچے ہوئے جو میرا سر میری ذمہ داری تھے کیونکہ ان کی ماں کو کوئی پروا نہیں تھی۔ پھر اس نے مجھ سے طلاق لے لی۔ تو میں نے بچوں کے لیے ماں باپ دونوں کا رول کیا۔ بیٹی اور بیٹا دونوں ڈاکٹر ہیں۔ چھوٹی بیٹی کو بھی سماجی کاموں سے لگاؤ ہے اس نے میری این جی او اور ادارے کا نظام سنبھالا ہوا ہے۔ میرے تینوں بچے بہت نیک اور انسانیت کے جذبے سے سرشار ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں شادی کر لوں۔ کنواری لڑکیوں

نخرے بہت بڑھ گئے ہیں۔ پھر حوریہ کے ساتھ بہت نغمی میں جو ٹریجڈی ہوئی اس کی وجہ سے کوئی اچھا رشتہ لگای نہیں۔“

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیا ٹریجڈی ہوئی ان کے ساتھ؟“ وہ پوری طرح عافیہ کی سمت متوجہ ہو گئے تھے۔

عافیہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ بات کے اختتام پر ڈاکٹر آفتاب یکدم خاموش رہے ہو گئے۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اس بچی کے ساتھ یہ سب ہوا ہے۔ بہرحال اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہو گی۔ اب آپ نے کیا سوچا ہے ان کے بارے میں؟“
”ہم نے کیا سوچتا ہے کسی کنوارے لڑکے کا رشتہ ملنا تو محال ہے کیونکہ جو سنتا ہے واپس نہیں آتا۔“
عافیہ نے وحشرے سے جھوٹ بولا تو ان کی فراغ پیشانی پر غنیمت سی برسرِ نیں۔

”میں اگر اپنے لیے حوریہ صاحبہ کا رشتہ طلب کروں تو آپ کا کیا جواب ہو گا؟“ اس خستہ خی کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ اب یہ معاملات خود طے کر چکا ہوں۔“

عافیہ یہ تو شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر آفتاب نے یہ سب کہا ہے۔

”میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔“

”میں باقاعدہ طور پر اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ آؤں گا آپ کے گھر۔ بہت سی باتیں آپ کو بتانی ہیں جن سے آگاہ ہونا آپ لوگوں کا بہت ضروری ہے پھر حوریہ صاحبہ کی مرضی بھی معلوم کرنی ہے آپ نے۔“
وہ بہت غصہ خیز کر بول رہے تھے اور عافیہ سر ہلا رہی تھی۔ بہت عجیب سا سحر تھا ان کی ذات میں۔ ان کے ٹرانس سے نکلنا بہت مشکل تھا۔

”حوریہ بہت خوش قسمت ہے پہلے حنا اور اب یہ ڈاکٹر آفتاب کا رشتہ۔“ عافیہ گھر پہنچنے تک یہی سوچتی آئی۔

کے والدین تک نے، اپنی بیٹیوں کے رشتے پیش کیے مگر نہ جانے کیوں آپ لوگوں سے اپنا بیٹیت سی محسوس ہوئی۔ پھر حوریہ صاحبہ کی زندگی میں جو بڑی بدی ہوئی، ایسی صورت میں انہیں سارا دنیا میں ثواب کا کام جب میں نے ہسپتال میں انہیں آپ کی ماں کی کا خیال رکھتے دیکھا، حوریہ صاحبہ کے دل میں بھی انسانی فلاح کا جذبہ موجود ہے۔ انہیں ایک سہمے کی ضرورت ہے اور مجھے اپنے بعد اپنے ہسپتال اور مشن کو زندہ رکھنے کے لیے تان خون اور ہوش و جذبہ کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت حوریہ صاحبہ بخوبی پوری کر سکتی ہیں۔ آپ کو پورا وقت دیتا ہوں۔ میرے بارے میں ہر طرح سے اپنا اطمینان کریں تو مجھے آگاہ کر دیجیے گا۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔

ڈاکٹر آفتاب کا ایک ایک لفظ متاثر کن تھا۔ وہ مینوں حمرزد سے خاموش تھے صرف وہی بول رہے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب کے جانے کے بعد بھی ان کے الفاظ اور احساس کی مہک جیسے فضا میں رہتی ہی تھی۔ ساری باتیں ٹھیک تھیں مگر نہ جانے کیوں حنان کو یہ سلسلہ پسند نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کی پرستانی متاثر کن تھی۔ ان کا نام تھا 'مقدس پیٹھ' سے وابستہ تھے۔ انہیں کسی قسم کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ ان کے مقابلے میں حوریہ ایک عام سی لڑکی ہی تو تھی جس کے لیے اگر یہ رشتہ آیا تھا تو یقیناً اس کی خوش قسمتی میں کام نہیں تھا۔ مگر ڈاکٹر آفتاب کی عمر اچھی خاصی تھی، انہوں نے بحیثیت بریڈر روز ریٹائر ہوئے تھے اور چنانچہ سال کے تھے گو دیکھنے میں وہ صرف چالیس سال کے نظر آتے تھے مگر اپنی عمر انہوں نے خود بتائی تھی کہ وہ چنانچہ سال کے ہیں۔ یہ بھی ان کی صاف نیت کا ثبوت تھا کیونکہ کوئی بھی دیکھنے والا انہیں چنانچہ سال کا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ان کے تین جوان بچے تھے۔ ڈاکٹر آفتاب کی سب سے چھوٹی بیٹی حوریہ کی اہم عمری تھی۔ بس یہی بات حنان کو پریشان کر رہی تھی۔ پر حیدر بھائی اور عافیہ کو ایسی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ کیونکہ

عافیہ نے حنان کے اعتراض کے جواب میں صاف۔۔۔ دیا کہ حوریہ اب کوئی سولہ سال کی بچی نہیں ہے جس کے لیے بیس سال کے لڑکے کا رشتہ نئے گا انہیں کی ہونے والی ہے وہ پھر نو جوانی میں جو داغ لگا اس کی وجہ سے کوئی کنواں لڑکا شادی نہیں کرے گا اس سے۔ مگر کہو کہ ڈاکٹر آفتاب نے سب کچھ جاننے کے بعد بھی کوئی اعتراض یا تاہنید کی ظاہر نہیں کی۔ ورنہ اس جیسے شخص کو لڑکیوں کی کمی نہیں ہے جو چاہیں چاہیں لالچ کی گڑیوں میں گھومتا ہے۔ وہ تو انسانیت کے نقطہ نگاہ سے حوریہ سے شادی کر رہا ہے۔ تم خود بتاؤ جب سے وہ یہاں آئی ہے، مطلب آئی جب سے اسے یہاں لے کر آئی ہیں کوئی ایک بھی رشتہ آیا؟

اس سوال کا حنان کے پاس جواب نہیں تھا سو وہ چپ ہو گیا۔ دل سے وہ بھی بھابھی کے خیالات و دلائل سے قائل ہو چکا تھا۔

”ٹھیک ہے بھابھی! آپ ڈاکٹر آفتاب سے نہیں کہ اس کام میں وہ مناسب نہیں ہے۔“

عافیہ خوش ہو گئی۔ پھر ہے حنان کو یہ بھی پتہ چلا کہ ایک عرصہ میں رہتے رہتے لگاؤ ہو ہی جاتا ہے پھر حوریہ بھی بھی نرم ہو گئی اور بے ضرر سی۔ حنان کو اپنی اس کرن سے ہمدردی تھی جو بھابھی کی لاکھ کوششوں کے باوجود ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اوپر سے حوریہ کی خاموشی نے اس کے احساس جرم کو بڑھا دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس کی شادی سے پہلے حوریہ ڈاکٹر آفتاب کے ساتھ رخصت ہو جائے۔

حوریہ عافیہ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ عافیہ اپنی بات مکمل کر کے اس کے تاثرات جانچ رہی تھی۔ جو ڈاکٹر آفتاب کے پروپوزل کا سن کر عجیب سے ہو گئے تھے۔

”دیکھو حوریہ! ہم سب تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔ آئی کی اپنی سوچا تھی اور حنان کی اپنی۔ اسے شوخ مزاج لڑکیاں پسند ہیں اور تمہارے علم میں شاید یہ بات

نہیں ہے کہ وہ شروع سے ہی متاشا کو پسند کرتا ہے۔ اس لیے جب پچھو پچھو نے اس کے سامنے تمہارا نام لیا تو اس نے مجھ سے آکر کہا کہ میں بھی میں متاشا کے سوا کسی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ آج کل کے لڑکوں کا تھیں پتہ ہی ہے۔ زور زورستی کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ سو حیدر نے بھی کہا کہ زندگی تو حنان نے گزار لی ہے، اس کی مرضی ہے چھوڑ دو۔ اب تم خود دیکھ لو۔ حنان مشکل کے بعد کتنا خوش ہے۔ معاف کرنا میں حقیقت پسند ہوں۔ تمہاری عمر ابھی بیس سال سے زیادہ ہو چکی ہے پھر تمہارے ساتھ جو بڑی ہوئی اس کی وجہ سے اب شاید ہی کسی لڑکے کے ساتھ تمہاری شادی ہو۔ لڑکے 'ماڈرن' طرح دار اور خوب صورت لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں ہر داغ سے پاک۔ ڈاکٹر آفتاب نے بڑے چاؤ سے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ آنکھیں بند کر کے اس کو رو ٹھیک ہے ڈاکٹر آفتاب کی عمر کچھ زیادہ ہے مگر تم بھی کم عمر نہیں ہو۔ ان حالات میں یہ رشتہ خیریت ہے۔“

ان کی "حقیقت پسندی" عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔

حوریہ نے اپنے سارے آسوا اندر اتار لیے ورنہ عافیہ بھی کی بے رحم سچائی نے اسے اندر تک زخمی کر ڈالا تھا۔

انہوں نے ایک تیرت کنی شکار کر لیے تھے۔ حنان اور متاشا کی پوزیشن بھی ٹھیک کر ڈالی تھی۔ اور اس کی عمر اور شکل و صورت کو بھی نشانہ بنا ڈالا تھا ڈاکٹر آفتاب کے قصیدے بھی پڑھ ڈالے۔

کتنی رات نر زرخیزی تھی مگر حیدر آکے نہیں دے رہی تھی۔ اس نے ٹائٹ جلا کر پانی پیا اور پھر نہ جانے کیوں آکھینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”بڑے خوب صورت 'طرح دار' اور ذوق لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔“ عافیہ جیتے دوبارہ اس کے کان میں بولی تھی۔ اس کی نگاہیں آکھینے میں نظر آتے اپنے

عکس پر جمی تھیں۔ لیے بادل کی کس کر باندھی ہوئی، پورے بازوؤں والی قمیص جس میں فننگ کا خاص خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ ڈھیلی ڈھالی شرٹ میں اس کے جسمانی خطوط اور مناسب بدن کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ نیل یا ش سے بے نیاز ناخن، جوڑیوں سے خالی کانیاں، ٹاک سردان، کچن کسی بھی قسم کے زور سے بے نیاز نہ تھی حوریہ شجاعت ایک عام سی لڑکی جس کی عمر اٹھائیس سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔ تقدیر کی مریالی سے ایک داغ بھی لگ گیا تھا۔ سوا اب ڈاکٹر آفتاب نے اسے پروپوز کر کے اس کی ذات پر احسن لیا تھا۔

آکھینے میں اپنے تھکے تھکے پڑھنے عکس کو دیکھتے دیکھتے اس کے عین نور سے لب لباب بھر گئے۔

وہ صورت ہے میری ایسی کہ ہو جائے کوئی باگل نہ آنکھیں ہیں کھری جھیلیں نہ زانیں گھٹنا جھکل صاحب دل جو ملا ہمیں وہ تھا دیوانہ تیرا تجھ میں ایسا کیا ہے کہ ہوا سارا زمانہ تیرا بچانے کب کی بڑھی ایک اٹھم کے چند مسرے یاد آئے تو عافیہ بھابھی کے جملوں کی شگینی کا بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

عافیہ اور حیدر نے ڈاکٹر آفتاب کو کل اس کے بھائی سمیت ہمارے انوائٹ کیا تھا۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر آفتاب ہی کی طرف سے ہونے تھے۔ حنان بھی گھر پر نہیں تھا۔

حوریہ کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ زندگی کے منظر اچھوڑ رہے تھے جب وہ چھوٹوں میں ابو جی کے ساتھ زندگی بسر کی۔

گھر میں پچھلے سال اسے اندر تک اترتے محسوس ہو رہے تھے۔ آج کل عافیہ زور و شور سے ڈاکٹر آفتاب کے رشتے کو فتنی کرنے کے چکر میں تھی۔ نی وی آن تھا مگر اس کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ رہے تھے۔ جب من گیت کی نعل

ایک تو اتر سے بچنے لگی۔

وہ چونک کر حال کی دنیا میں آئی۔ اور اگلے ہاتھ سے آنکھیں بے دردی سے رگڑیں شاید حنان بھائی ہیں۔ ”صوفے پر بڑا دھبہ اٹھا کر اس نے سر اور جسم کے گرد لیٹا اور باہر گیسٹ کی طرف آئی۔ چونکہ ارچھٹی لے کر گاؤں گیا ہوا تھا سو گیسٹ کھولنے کا کام اکثر و بیشتر اسے ہی سہا انجام دینا پڑ رہا تھا۔

گیٹ کے سوراخوں سے بلیک کلر کی گاڑی نظر آ رہی تھی۔ مگر ڈرائیونگ سیٹ پہ اجنبی سی صورت براجمان تھی۔

حوریہ نے دھبہ اچھی طرح منہ اور سر کے گرد لیٹا اب صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔

اس نے گیسٹ کھول دیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر نیچے آ گیا۔

”السلام علیکم، حنان گھر پہ ہے؟ میں اس کا دوست شیر اقلین ہوں۔“ ”نوداروئے تعارف کرایا۔“

”مگر وہ تو گھر پہ نہیں ہیں۔“

”مجھ سے اس نے کہا تھا کہ شام کو گھر پہنچ جاؤں اور خود وہ غائب ہے۔“ ساتھ ہی اس نے رسٹ ڈائج پہ تاہم دیکھا۔

”حنان بھائی گھر پہ نہیں ہیں۔“ اس نے دوبارہ زور دے کر کہا۔ تو تب پہلی بار شیر اقلین نے اس کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں حنان کی کیا گتھی تھی یہ لڑکی۔ نہ جانے کیوں اسے لگا اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ابھی وہ

وایسی کا قصد کر رہی رہا تھا کہ حنان کی گاڑی کا مخصوص بارن سائی رہا جو اس نے شیر اقلین کی گاڑی کو دیکھ کر بجایا تھا۔ سڑک پہ مڑتے ہی دور سے اس نے اپنے

گیٹ کے آگے شیر اقلین کی گاڑی کو دیکھ لیا تھا۔

حنان اسے اندر لے گیا۔

حوریہ کچن میں آگئی حنان نے اپنے دوست کی خاطر درازت کے لیے بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

پہلے اس نے کولڈ ڈرنکس اور مینگو شیک اندر بھجوا دیا اور پھر چائے کے ساتھ دیگر لوازمات تیار کرنے لگی۔

شیر اقلین حنان کا بہت قریبی دوست تھا۔ دونوں نے اکٹھے انجینئرنگ کی تھی۔ انجینئرنگ کرنے کے بعد شیر اقلین اپنی فیملی کے پاس انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اس کے ماما پاپا اور دو بھائی وہیں مقیم تھے۔ یہاں پاکستان میں اس کی نھیال اور دوھیال تھی۔

شیر اقلین کے والد نوجوانی میں ہی انگلینڈ چلے گئے تھے۔ شادی ہوئی تو بیوی کو بھی وہیں بلوا لیا۔ وہاں ان کا

برنس بہت اچھے طریقے سے سیٹ تھا۔ شیر اقلین پاکستان آتا جاتا رہتا تھا۔ دادا جین کو بھی اسے بے حد

لگاؤ تھا۔ کچھ عرصہ گزرتے ہی انہیں اس کی یاد ستانے لگی۔ اپنے بڑے بیٹے کی ناگہانی موت کے بعد وہ بکھر

گئے تھے۔ ان کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے اس نے انجینئرنگ پاکستان سے ہی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس

دوران حنان سے اس کی دوستی کا آغاز ہوا جو اب بہت گہرے لگاؤ اور خلوص میں بدل گئی تھی۔

چائے بن گئی تھی۔ حوریہ دیگر لوازمات ٹرالی میں سجا کر ڈرائنگ روم کے دروازے پر دستک دے رہی

تھی۔ حنان اٹھ کر باہر آیا اور ٹرالی اندر لے گیا۔

حوریہ اس کے دوستوں یا دیگر اجنبی مردوں کے سامنے نہیں آتی تھی۔ وہ شرعی پردہ کرتی تھی اور سخت

سے کارند بھی اس پہ۔ حنان نے چائے خود سرو کی اور کیباب کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

”کھاؤ بہت مزے دار ہیں۔ میری کزن نے بنائے ہیں۔“

حنان نے خود بھی سب سے پہلے کہا بول پر ہی ہاتھ صاف کیا۔

”تمہاری بہ کزن؟ تم نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا۔“

”ہاں یار! کبھی اس کا موقع ہی نہیں آیا۔ تم بھی تو چار ماہ انگلینڈ اور پندرہ دن پاکستان گزارتے تھے۔ خیر یہ

میرے ماموں کی اکلوتی بیٹی ہے اور ہمارے پاس ہی رہتی ہے بے چاری کے پیرئیں نہیں ہیں۔“ حنان نے لفظ بے چاری پہ زور دے کر کہا۔

وہ باتیں کر رہے تھے۔ دنیا جہاں کے قہرے چھڑے ہوئے تھے پھر حیدر بھائی اور عافیہ بھی چلے آئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

حیدر نے رات کا کھانا کھائے بغیر اسے جانے نہیں دیا۔

کھانے کے بعد حنان اسے گجڑی تک چھوڑنے آیا۔ حوریہ بجری کی روش کے ساتھ ساتھ بنے لان میں ٹھہر رہی تھی۔

شیر اقلین کے باہر آنے سے اس نے دھبے سے منہ چھپا کر رخ موڑ لیا تھا۔ شیر اقلین کی اچھٹی سی نظر پڑی تھی جسے اس نے فوراً ہی موڑ لیا تھا۔

”بے چاری حنان کی کزن۔“ اس نے افسوس سے سوچا اور گاڑی اشارت کر کے وہاں سے نکل آیا۔

”حیدر کہہ رہے ہیں۔ چائے تیار ہونے کے بعد ڈرائنگ روم میں آجاؤ اور ہاں تمہارا ٹینک سوٹ میں

لے نکال کر گھر پہنچا دیا ہے۔ وہی برنس لگاؤ اور دھبہ

ہاں ہے۔“ حوریہ نے کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ ان کے

باقاعدہ طور پر تمہارا رشتہ مانگا ہے سو تمہیں دیکھنا ان کا حق بنتا ہے۔“ عافیہ اس کی پشت پہ کھڑی گزشتہ پندرہ

منٹ سے بول رہی تھی۔ حوریہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کی طرف سے مسلسل خاموشی پاکر وہ جھنجھلا

سی اٹھی۔

”حوریہ! میں تم سے کہہ رہی ہوں اگر تم راضی نہیں ہو تو میں میں منع کر دیتی ہوں ان لوگوں کو۔“

”نہیں بھابھی! ایسا مت کیجئے گا۔ میں راضی ہوں۔“

وہ جھنجکے سے مڑی اور پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”میری قسمت میں ایسے ہی رشتے لکھے ہیں تو ڈاکٹر آفتاب میں کیا برائی ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”حوریہ! تم ناشکری کرتی ہو ایسے رشتے سے کیا

مطلب ہے تمہارا۔ شکر کرو پرووگار کا۔“

”ٹھیک ہے بھابھی! میں آئی ہوں ڈرائنگ روم میں۔“ اس کی سعادت مندی سے مطمئن ہو کر عافیہ

دوبارہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو یہ محسوس کیے بنا نہ سکی کہ ڈاکٹر آفتاب اور ان کے

بھائی کی نظریں اس پہ جم سی گئی ہیں۔ پینک کپڑوں میں لمبوس وہ خود کو تو عام سی ہی لگ رہی تھی مگر ان دونوں

اشخاص کی نظریں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

”بسم اللہ آئیے۔“ ڈاکٹر آفتاب اس کی آمد پہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچے میں وہی مخصوص مشفقانہ پن تھا

جو ان کی شخصیت کا خاصا تھا۔ وہ سر جھکائے پاس پڑے

صوفے پہ ٹک گئی۔ ڈاکٹر آفتاب کی نگاہوں سے اس کے لیے پسندیدگی غیاں تھیں۔ پینک کپڑوں میں اس کی

صاف رنگت دکھ سی رہی تھی۔ تھکے نقوش سمیت گہری مولیٰ بادامی آنکھیں خاصی متاثر کن تھیں۔

ڈاکٹر آفتاب اسے دیکھنے کے بعد کتنے مطمئن تھے یہ کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔

”اور کیسی ہیں حوریہ لی بی آپ۔ کیا مصروفیت ہیں آپ کی؟“ ڈاکٹر آفتاب کا چھوٹا بھائی اس سے مخاطب

ہوا۔

”میں ٹھیک ہوں اور کوئی خاص مصروفیات نہیں ہیں۔ گھر پہ ہی ہوتی ہوں۔“ اسے جواب دینے میں

خاصی مشکل پیش آئی۔

جواباً انہوں نے اسے بڑی گہری نگاہ سے دیکھا۔

”عافیہ بھابھی نے بتایا ہے کہ آپ نے ماس کیونیکیشن میں ایم اے کر رکھا ہے تو تمہیں جانب کیجئے ناں۔ پرائیویٹ لی وی چینل پہ آپ آراہم سے

میٹ ہو سکتی ہیں کیونکہ میڈیا آج کل بہت اسٹرائٹنگ ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائیے۔ اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھائیے۔ اگر آپ راضی ہوں تو میں کسی بھی لی وی چینل پہ آپ کو جاب دلا دیتا ہوں۔ بھائی جان خود بھی خاصی آرویج رکھتے ہیں۔“

ڈاکٹر آفتاب کے بھائی کی لمبی چوڑی بات کے

جواب میں اس نے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ آئی۔

جائے کیوں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
جائے وقت ڈاکٹر آفتاب نے عافیہ سے حوریہ کا
سیل نمبر لے کر نوٹ کر لیا تھا اور اس کے لیے انہوں
نے باقاعدہ پہلے حیدر سے اجازت لی تھی۔

”میں نے حوریہ صاحبہ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔
میں یہاں بھی کر سکتا تھا مگر شاید فیس نوٹیں وہ نہ کر
پائیں کیونکہ وہ روایتی سی مشرقی لڑکی کی طرح ہیں۔ میں
چاہتا ہوں خود ان کی مرضی معلوم کروں اپنے بارے
میں۔“

ان کے اس طرح بات کرنے سے حیدر کے دل
میں لہن کی عزت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے بخوشی
حوریہ کا سیل نمبر نوٹ کر دیا تھا۔

حوریہ سونے کی تیاری کر رہی تھی جب اس کا سیل
گنگنایا۔

اس نے نمردیکھے بغیر آن کر لیا۔
”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔“ بڑے پرجوش طریقے سے سلام
کا جواب دیا گیا۔ آواز اس کے لیے اجنبی تھی۔
”جی آپ کون؟“

”میں ڈاکٹر آفتاب بات کر رہا ہوں۔ اس وقت
آپ کو بستر کرنے پر معذرت چاہتا ہوں مگر مجبوری
ہے، فرصت کے لمحات کم کم ہی ملتے ہیں۔ میں اس
وقت بھی ہاسپٹل میں ہوں۔ خوش قسمتی سے تھوڑی
فرصت ملی ہے تو سوچا آپ سے بات کر لوں۔“

حوریہ کی نظر دیوار گیر کڑاک کی طرف اٹھی جو بارہ کا
ٹائم تیار ہی تھی۔ وہ متاثر ہی ہو گئی۔ ”اپنے پیشے سے
کتنا مخلص ہے ورنہ کس کو اتنی پروا ہوتی ہے مریضوں
کی۔“ اس نے دل میں سوچا۔

ڈاکٹر آفتاب نے اس سے چھوٹے چھوٹے سوال
پوچھے۔ اس کے والدین کے بارے میں ”گاؤس کے

بارے میں پھر پھر پھو اور ان کے گھر آمد کے بارے میں
وہ پھر پھر کے جواب دیتی گئی۔

”آپ کو بتاؤں کہ میں راسٹر بھی ہوں۔ میری
کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ میں شاعری بھی کرتا
ہوں۔ مگر میرے قلم سے اللہ کی تعریف کے سوا کچھ
لکھتا ہی نہیں۔ میں نے رومینٹک شاعری نہیں کی
کبھی نہ مجھے اس سے لگاؤ ہے لیکن کچھ دن پہلے ایک
نغمہ پڑھی اور وہ اس وقت مجھے یاد آگئی ہے اگر آپ کی
اجازت ہو تو سائمن کی نذر کروں؟ جانے کیوں آپ کی
خاموشی کچھ بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔“

”جی جی سنائیے۔“ اب حوریہ کو بھی دلچسپی ہونے
لگی تھی۔

تم معصوم سی بھولی بھالی سی
ابھی ابھی بے کل بے کل

مگر تم کچھ سمجھتی رہتی ہو
تم کو باتیں کب آتی ہیں

لیکن جب کچھ کہنا چاہو
انکھیں آنکھوں کی جانی ہو

اور سب کچھ منواتی ہو
اور نہ دنیا والے لے لے لے لے

ان کو مجھے میں سمجھاؤں
باہر سے چپ رہتی ہو پر اندر سے تم بول رہی ہو۔

اک دروازہ بند ہے لیکن سو دروازے کھول رہی ہو
بھولی بھالی لڑکی

اب جو کہنا مجھ سے کہنا اب جو سننا مجھ سے سننا
دنیا یوں ہی کہتی ہے تم کو باتیں کب آتی ہیں

ڈاکٹر آفتاب کا انداز بڑا دھیمسا تھا۔ حوریہ خاموش
سی ہو گئی۔

”لگتا ہے یہ جس کسی نے بھی لکھی ہے آپ کے
لیے لکھی ہے۔ میں آپ سے کل بات کروں گا۔ ابھی
ایمر جنسی آئی ہے۔ کچھ باتیں کرنا ہیں جن کا جاننا آپ
کے لیے بہت ضروری ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا اللہ
حافظ۔“

ڈاکٹر آفتاب نے فون بند کر دیا۔ حوریہ کافی دیر ان
کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر اس نے خود کو حالات
کے دھیارے پہ چھوڑ دیا۔ کم سے کم اب وہ بے سکون تو
نہیں تھی۔

عافیہ کے کچھ دنوں سے کمر میں درد تھا۔ میڈیسن
لینے کے باوجود آرام نہیں آ رہا تھا۔ حیدر سے اس نے
ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر آفتاب کو چیک کرالو۔
بات اس کے دل کو گئی تھی۔ اس نے جانے کیا سوچ کر
حوریہ سے بھی چلنے کو کہا مگر اس نے بڑے سیدھے سے
انکار کر دیا۔

سو عافیہ اکیلی ہی گئی۔
ڈاکٹر آفتاب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے سب کا
حال احوال پوچھا آج تو حیدر بھی ساتھ تھے۔
”لگتا ہے آپ نے ہاں کے انتظار میں ہماری
جو تیاں گھسا دینی ہیں۔“ ڈاکٹر آفتاب نے مسکراتے

ہوئے بڑی لطیف سی جوت کی تو عافیہ نے بڑی
”آپ کو کچھ کہنا ہے“ فیصلہ کر لیا تھا۔

”میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میرے بارے میں
ہر طرح کی تسلی کر لیں۔ جھان بین کروالیں مگر یہ کام
جلدی کریں تو اچھا ہے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ بات
پھیلے۔ آپ کو پتہ ہی ہے کہ نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔
ایک بے سائبان لڑکی کو میں سہارا دوں گا تو کوئی بھی
میرے اس جذبے کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ لانا
سب مجھے لعنت ملامت کریں گے کہ خود سے اتنی کم عمر
لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ میری پہلی بیوی نے اگرچہ
طلاق لے لی ہے مگر اس موقع پر وہ بھی مخالفت کریں
گی اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ کام جلد ہی ہو۔ ساتھ
یہ کہ میں آج ہاسپٹل حوریہ صاحبہ کے نام کرانا چاہتا
ہوں۔ وہ اس میں میری ہمارے ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں
کہ میرے مرنے کے بعد وہ میرے اس انسانی فلاح
کے مشن کو جاری رکھیں۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ

سال، چار سال زیادہ سے زیادہ دس سال اور جیوں گا
اس کے بعد حوریہ صاحبہ نے ہی آفتاب فاؤنڈیشن کو
جاری رکھنا ہے۔ میری ہمارے ہوں گی۔“

حسب معمول ڈاکٹر آفتاب بول رہے تھے اور وہ
دونوں کسی حیرتہ معمول کی طرح سن رہے تھے۔
”کتنا بے غرض اور بے ریا شخص ہے۔ فرشتہ ہے
فرشتہ۔“

عافیہ اور حیدر دونوں کی سوچ اس مقام پر ڈاکٹر
آفتاب کے بارے میں ایک جیسی تھی۔ ہر ملاقات
میں وہ پہلے سے زیادہ متاثر ہو رہے تھے۔
ڈاکٹر آفتاب نے بڑی توجہ سے عافیہ کو چیک کیا کچھ
ضروری میٹ کے لیے جن کی رپورٹ کچھ ایسی
حوصلہ افزا نہیں تھی۔

”عافیہ بی بی! آپ کا جگر ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے
آپ کو میں دس دن ایڈمٹ کروں گا اس کے بعد آپ
کی یہ پرابلم جڑ سے ختم ہو جائے گی، کیا خیال ہے آپ
کا حیدر؟“

عافیہ نے نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے اسے
ہاں کہہ دیتے ہی جی۔ کیونکہ وہ خود بھی پریشان تھا۔ عافیہ
اس کی بیوی تھی، بچوں کی ماں تھی۔

”آپ فکر نہ کریں یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی
کیونکہ جہاں ایلوپیتھک طریقہ علاج ناکام ہوتا ہے
وہاں سے چائنیز طریقہ علاج شروع ہوتا ہے اور یہ میں
اپنے جن مریضوں پہ آزمایا ہے اور اللہ کے فضل سے
سب نے شفا پائی ہے۔“

ڈاکٹر آفتاب نے عافیہ کو روم میں شفٹ کر دیا۔
کمرے میں لی وی فون، ایچ بی بائو روم کی سہولت
موجود تھی۔ ہاسپٹل صاف ستھرا تھا۔ حیدر مطمئن تھا۔
اس نے ہاسپٹل سے ہی فون کیا گھر پہ اور بتایا کہ عافیہ
ایڈمٹ ہو گئی ہے۔

عافیہ کے سیکے والے پریشان ہو گئے۔ شام کو ناشا
بڑے بھائی اور بھابی کے ساتھ پہنچ گئی۔ حنان بھی
آفس سے فری ہو کر ادھر آ گیا۔

حوریہ روز ہاسپٹل آتی اور آتہ وقت عافیہ کے لیے کچھ نہ کچھ پریشانی کھانا بنا کر لے آتی۔ جب سے عافیہ ایڈمٹ ہوئی تھی، ڈاکٹر آفتاب کے چکر اس کے روم کی طرف زیادہ ہی بڑھ گئے تھے۔ خاص طور پر جب حوریہ آتی تو تب ڈاکٹر آفتاب لازماً عافیہ کی طبیعت کا پوچھتے آتے۔

حیدر اور عافیہ نے ابھی تک کھل کر ہاں نہیں کی تھی مگر ان کا رویہ جو صلہ شکن بھی نہیں تھا۔ سو ڈاکٹر آفتاب خوش تھے انہیں بات بنتی نظر آرہی تھی۔ اس دن واپسی پر حوریہ کو ڈاکٹر آفتاب نے اپنے روم میں بلوایا۔ ڈاکٹر صاحب کی خورد سکرٹری نے اسے برقی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کی طنزیہ نظروں سے الجھتی اندر چلی گئی۔

ڈاکٹر آفتاب نے دیوار کے ساتھ رکھے صوفے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی انٹرکام پر اندر دے چائے لانے کا آرڈر دیا۔

وہ ابھی تک سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”حوریہ بی بی! بہت بھولی ہیں آپ، کچھ دن پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے بارے میں سوچ لیں، اسی سوال کا جواب حاصل کرنے کی خاطر میں نے آپ کو یہاں زحمت دی ہے۔“ وہ مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”اگر قدرت کو یہی منظور ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”مطلب آپ کی طرف سے ہاں ہے؟“

”جی ہاں!“ اس نے مختصراً جواب دیا اور دیوار گیر الماری میں کچی کتابیں دیکھنے لگی۔ وہ بھی اس کی دلچسپی بھانپ گئے۔

”یہ کتابیں میرا ورہنا بچھونا ہیں۔ میں نے شہر سے ہٹ کر بہت خوب صورت گھر دیکھا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ کا ہے اور بہت خوب صورت ہے میرا ارادہ ہے کہ شادی کے بعد ہم وہاں رہیں گے۔ میں وہ گھر آپ کے نام کر دوں گا۔ دوسرے میں نے جو گھر ہے

سارا عورتوں اور بچوں کے لیے بنایا ہے۔ میں اس کے انتظامات بھی کلی طور پر آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور اس ہاسپٹل کی ذمہ داریاں بھی آپ کو سنبھالنی ہیں میں تھک گیا ہوں سات سال سے میں نے ایک دن بھی چھٹی نہیں کی ہے۔ دن رات کام کیا ہے ڈاکٹر آفتاب ایک انسان نہیں بلکہ مشین کا نام ہے۔

آپ کو پتہ ہے ہاسپٹل میں روزانہ کتنے سو نوگوں کے لیے کھانا پلکا ہے۔ اس ہاسپٹل میں میں نادار اور غریب لوگوں کا تقریباً مفت علاج کرتا ہوں۔ لوگ دور دراز سے میرا نام اور شہرت سن کر میرے پاس آتے ہیں، انہیں کھانے پینے اور رہائش کا مسئلہ ہوتا ہے سو مریض کے ساتھ ہی جو تمار دار ہوتا ہے اس کے لیے بھی ہم نے سونے اور رہنے کے ساتھ کھانے کی سہولت فری رکھی ہے اور اس مذ میں کوئی پیسہ وصول نہیں کیا جاتا۔ اللہ دے رہا ہے سو سب کام چل رہا ہے۔ کھانا آپ نے دیکھا ہی ہو گا جو ہاسپٹل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کس معیار کا ہے۔ لوگ دعا میں رہتے

ہیں مجھے آپ کو جواب دے گا کہ میرے پاس دو بیویاں ہیں۔ میں نے ان بچوں کا ایک سال تک فری علاج کیا اور کوئی پیسہ نہیں لیا۔ خدا کی کرپا کہ وہ بچے صحت مند ہو گئے۔ ان کے ماں باپ مجھے دعا دیتے ہیں کہ میری بدولت وہ بچے آج صحت مند زندگی گزار رہے ہیں۔

میرے پاس ہر مریض کی کیس، سسری کا ریکارڈ ہے۔ صحت مند ہو کر جانے سے پہلے میں ان کے خیالات قلمبند کروا تا ہوں آپ پر بھیے گا، کیسے کیسے لوگ میرے پاس سے صحت مند ہو کر گئے ہیں۔

آپ بہت خوش قسمت ہیں جو میرے دل کو بھانگی ہیں۔ ایک انس سا ہو گیا ہے آپ سے۔ یہ سوچ ذہن میں رکھ کر میرے پاس آئے گا کہ آپ دنیا کے بہترین مرد کے پاس آرہی ہیں۔ مجھے آپ کے گھر والوں کی سمجھ نہیں آتی کہ مجھے فاسٹل جواب کیوں نہیں دے رہے ہیں۔ میرے بیٹے نے باہر جاتا ہے اور وہ کہہ رہا

ہے کہ ہا میں آپ کی شادی کی خوشی دیکھ کر جاؤں گا۔“

حسب معمول ڈاکٹر آفتاب بول رہے تھے اور وہ سن رہی تھی۔

ابھی نہ جانے وہ اور کیا کہتے کہ سیکرٹری دروازہ کھول کر اندر آئی اور بہت آہستہ آواز میں ان سے کچھ کہا جو حوریہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

”میں گھر جا رہا ہوں پھر آپ سے گپ شپ ہوگی۔“

جانے سے پہلے میں آپ کی بھابھی کو دیکھ لوں۔ آپ بھی آئیے میرے ساتھ۔“

وہ بھابھی کے روم کی طرف بڑھ گئے۔ حوریہ جب ان کے پیچھے اندر داخل ہوئی تو حنان آیا بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ خود میں عجیب سا محسوس کرنے لگی جیسے کوئی چوری کر کے آئی ہو۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی نہ ڈاکٹر آفتاب کے لیے اور انداز سے کسی گھٹیا رویے کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ سامنے والے

کمرے کے دروازے پر کھڑی ہو کر حوریہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حوریہ نے اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ تھا

ڈاکٹر آفتاب نے بڑی توجہ سے عافیہ کو خود چیک کیا اور ان کی کچھ میڈیسن تبدیل کیں۔ نرسز کو اس کا خصوصی خیال رکھنے کی تاکید کر کے وہ گھر روانہ ہوئے۔ حوریہ بعد میں حنان کے ساتھ ہی گھر واپس آئی۔

آج اتوار تھا۔ حیدر اور حنان دونوں گھر پہ تھے۔ حوریہ نے ناشتے کے بعد بھابھی کے لیے ان کی دو پسندیدہ ڈشز تیار کیں۔ آج حیدر نے بچوں کو بھی ہاسپٹل لے کر جانا تھا۔

دونوں بعد عافیہ ڈسچارج ہو رہی تھی۔ حوریہ کے علاوہ سب ہی ہاسپٹل گئے۔ وہ گھر کے کام پختائی رہی۔

کچھ دن بھابھی نے بطور خاص اسے آنے کی تاکید کی۔

حیدر بھائی اسے صبح ہی لے کر ہاسپٹل آگئے۔ عافیہ کی طبیعت بہت ہشاش بشاش نظر آرہی تھی۔ کل ویسے بھی انہیں گھر آ جانا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب نے اسے پورا ہاسپٹل دکھایا پھر آخر میں اسے وہی آئی بی رومز دکھائے جہاں اس وقت مظفر آباد سے لائی گئی ایک بچی ایڈمٹ تھی۔ اسے سب اسٹاف سے ملوایا اور آخر میں عافیہ کی تازہ ترین رپورٹس دکھائیں۔ جس میں ان کی پرانی بیماری کا نام و نشان تک نہ تھا۔

عافیہ بہت خوش تھی۔ اپنی رپورٹس کی بابت اسے بھی پتہ تھا۔

مسند پر کو حنان کا دوست عافیہ بھابھی کا پتہ کرنے آ گیا ساتھ حنان بھی تھا حوریہ نے رخ موڑ کر حجاب درست کیا۔ عافیہ ان دونوں سے باتیں کرنے لگی۔ حوریہ نے کونڈر ٹکس حنان اور شیر انگن کو دیں۔ شیر انگن نے شائستگی سے انکار کر دیا۔

عافیہ اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ تھا

ڈاکٹر آفتاب نے ان سب کو اپنے گھر دعوت پہ انوائٹ کیا تھا۔ ظاہر ہے حوریہ نے تو جانا نہیں تھا۔ سو حنان حیدر اور عافیہ ہی گئے۔

ڈاکٹر آفتاب کا گھر بہت شان دار اور ویلڈیکوریشنڈ تھا۔ ہر شے سے امارت اور بلند شوق کا اظہار ہو رہا تھا۔

ہر شے سلیقے اور نفاست سے سجی تھی۔ عافیہ اور حیدر بہت متاثر ہوئے۔ وہیں پہ ان کی ملاقات ڈاکٹر آفتاب کی سب سے چھوٹی بیٹی اور ان کی بہت بوڑھی والدہ سے ہوئی جن کی بابت وہ یہ جان کر بہت حیران ہوئے کہ ان کی عمر سو سال سے زائد ہے۔ ڈاکٹر آفتاب نے مزید بتایا کہ میری والدہ کو روحانیت سے بہت دلچسپی ہے اور یہ گزشتہ تیس سال سے چلے میں ہیں اور کسی سے بات نہیں کرتیں۔ وہ انہیں خود اپنی والدہ کے کمرے میں لے گئے تھے جہاں وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں، ان کے سامان کا جواب انہوں نے سر کے اشارے سے دیا اور پھر اس کے علاوہ انہوں نے بات

نہیں کی۔ ڈاکٹر آفتاب انہیں بتاتے رہے کہ اماں جان کی روحانی صافیا جیتوں سے نام لوگوں نے بہت فیض دیا ہے وہ جس کی طرف نظر کرتی ہیں اس کی قسمت سنو رہی ہے۔

غافہ اپنے دیکھنے والے کریمہ گنی اس کے اپنے خود ساختہ مسائل اور پر اہل مزاج تھے۔

ڈاکٹر آفتاب کو حوریہ کے رشتے کے بارے میں بااں کر کے لوٹے۔ جس پہ ڈاکٹر آفتاب بہت خوش تھے۔

غافہ، پیرشا اور حنان کی شادی کی تیاریوں میں بھی پیش پیش تھی۔ حنان کی بری بھی بنائی تھی۔ دوسرے مور یہ کو بھی رخصت کرنا تھا۔ حوریہ کا اتنا زیادہ پر اہل نہیں تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر آفتاب نے کہا تھا کہ وہ سادگی سے نکاح کر کے حوریہ کو لے جائیں گے اور ان کے ساتھ صرف چھ سات افراد ہوں گے۔

غافہ کے تو ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے کیونکہ ڈاکٹر آفتاب نے نو دس دن کے شارٹ نوٹس پہ نکاح کا بولا تھا۔ وہ بے چاری بوکھلائی ہوئی تھی کیونکہ اس کے ماہ حنان اور نیتاشا کی شادی بھی تو تھی۔

وہ زیوراب کا آرڈر دے آئی تھی۔ اب حوریہ کے لیے بھی تو سونے کی جیولری بنانی تھی۔ روایتی عورتوں کی طرح اس کی جان لگی جا رہی تھی کہ پیسہ حیدر کی جیب سے خرچ ہو گا۔

رات سونے کے لیے وہ لیٹی تو اس خدشے کا اظہار بڑ سا انداز میں حیدر سے کیا تو وہ خوب ہنسا۔

”ارے حوریہ کے لیے کچھ بھی خریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ غافہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

”بھئی اس کے پاس سونے کی جیولری کافی زیادہ ہے۔“ حیدر نے وضاحت کی۔

”نکاح میں تو بھی نہیں دیکھی۔“

”ارے جگ اکر میں پڑی ہے۔ اسی نے گھڑ رکھنے

ہی نہیں دی، زمینوں جائیدادوں کے کاغذات بھی اکر لیے ہیں۔ اسی بہت وہ بھی طبیعت کی مالک تھیں تب ہی کوئی چیز بھی حوریہ کو گھوڑی نہیں رکھنے دی۔“

حیدر اپنی دھن میں بتا رہا تھا اور غافہ حیران ہو رہی تھی۔

”کون سی زمینوں جائیدادوں کے کاغذات؟ اور جیولری کس نے لے کر دی حوریہ کو؟“ کچھ دیر پہلے کی چھائی بیزاری ختم ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ شوق اور تجسس نے لے لی تھی۔ حیدر نے بات ہی ایسی کی تھی۔ وہ دل میں اندازے لگا رہی تھی کہ شاید آئی نے مضامین والی گھر اور مارکیٹ والی دکانیں حوریہ کے ہاتھ کی ہوں گی کیونکہ وہ چاہتی بھی تو اسے بہت زیادہ تھیں۔ وہ سٹلگ رہی تھی کہ ابھی تک اسے اس بات کی ہوا کیوں نہیں ملنے دی گئی کہ حوریہ کے نام اتنا کچھ آئی کر گئیں۔

”اسی نے حوریہ کے نام کچھ نہیں کیا۔ نہ ہی اسے ضرورت تھی۔“

”تمام جائیداد کی وارنٹ حوریہ کے پاس تھی۔ اور وہ ٹھیک ٹھاک امیر بنے اور جیولری لے گئے۔ وہ تو بڑی بڑی تھی کہ کل کو شادی ہوئی تو کام آئے گی ورنہ حوریہ کو اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ بس ماموں جان کی بے وقت موت نے حوریہ کو بالکل اکیلا کر ڈالا تھا تب ہی اسے اسی اپنے ساتھ لے آئی تھیں مگر ہم سب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسی کو حوریہ کی دولت، جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے اس کا پیسہ سب کا سب اسی کے نام اکاؤنٹ کھلوا کر جمع کروا دیا تھا۔“

حیدر نے مختصراً بتایا اور خاموش ہو گیا۔

اسی کے تذکرے پہ اس کا دل اداس ہو گیا تھا۔ غافہ دل ہی دل میں حوریہ کی زمینوں اور بینک بیلنس کا حساب لگا رہی تھی۔ اتنی اہم بات اسے آج پتہ چلی تھی۔ جس پہ وہ جتنا بھی حیران ہوئی کم تھا۔

ڈاکٹر آفتاب نے کھلوا دیا تھا کہ حوریہ کے لیے شادی کے کپڑے، جوتے، جیولری جو جو بچھ لیتا ہے خود لے

لیں ان کی طرف سے بھی پھر جو بھی خرچہ آئے۔ مجھ سے پیسے لے لیجئے گا۔ آج پہلی بار غافہ ابھی تھی۔

”کمال ہے خود کر لیں ناں حوریہ کی شاپنگ۔ اپنی بیٹیوں سے کہیں۔ وہ کر لیں۔ آرام سے کہہ دیا کہ سب کچھ لے لیں پھر پیسوں کا مجھے بتادیں۔ حد ہوتی ہے۔“

وہ اونچا اونچا بول رہی تھی۔ حوریہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا تھا۔

رات ڈاکٹر آفتاب کا فون آگیا۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی۔ سیل اٹھایا تو ڈاکٹر آفتاب کاننگ کے الفاظ چک رہے تھے۔

”میں نے سوچا، آپ سے پوچھ لوں کہ آپ کی شاپنگ کہاں تک پہنچی؟“ آج ان کے لیے ہیں بے پناہ شوخی تھی۔ رنگ و جنک ہی بدلا ہوا تھا۔

”میں نے تو کوئی شاپنگ نہیں کی۔“ حوریہ کا لہجہ

بیشمار کی طرح پتہ چل گیا تھا۔

”اچھا اچھا یہ بات ہے۔ چوائس تو آپ کی بھی اچھی ہے اب مجھے ہی دیکھ لیں۔ ہا ہا۔“

ڈاکٹر آفتاب نے اپنے مذاق سے خود ہی لطف اٹھایا۔

”وہی میں دیکھنے میں کیسا لگتا ہوں، میرا مطلب ہے عمر کے حساب سے۔“ انہوں نے سوال کیا تو حوریہ نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔

”ڈاکٹر صاحب! دیکھنے میں آپ زیادہ سے زیادہ چالیس سال کے لگتے ہیں اور کسی طرح بھی جوان بچوں کے باب نہیں لگتے۔“ حوریہ نے ان کی ظاہری شخصیت سے نظر آنے والے تاثر کا کھل کر اظہار کیا تو ڈاکٹر آفتاب کو بہت اچھا لگا۔

”اور پتا ہے دیکھنے میں آپ بھی اکیس بائیس سال

سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔ اللہ نے اتنے پیارے نقش دیے ہیں۔ اتنی خوب صورت موٹی موٹی آنکھیں دی ہیں۔ آنکھیں بیٹھنے کا خوب صورت انداز دیا ہے۔ لہجہ اور آواز دونوں متاثر کن ہیں مگر اس کے باوجود آپ نے خود کو گروم نہیں کیا۔ تھوڑی سی توجہ اپنی لکس پہ دیں تو واللہ قیامت ہیں آپ۔“

حوریہ نے اپنی دھن میں ڈاکٹر آفتاب کا آخری جملہ نہیں سنا ”کیا مطلب ہے آپ کا، میں خود پہ توجہ دیتی تو ہوں۔“

”خاک توجہ دیتی ہیں آپ۔ ناخن نکل پالش سے خالی ہیں۔ آنکھوں میں کاجل نہیں ہے ہاتھ آنکھیاں کان ہر طرح کی جیولری سے محروم ہیں اور رہی سہی کسر آپ نے جالب لے کر پوری کر دی ہے۔ اپنی دلکشی کا آپ نے ستیا ناس کر دیا ہے یہ دس گز کا تھان اپنے گرد لپیٹ کر پتا ہے لوگ آج کل برقعے والیوں اور نقاب والیوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟“

”ڈاکٹر صاحب! مجھے لوگوں کی رائے سے کچھ نہیں لینا پڑتا ہے۔ اپنے جسم کو ہاں پناہ دے اس لیے میں لوگوں کی پروا نہیں کرتی پھر یہ اللہ کا حکم بھی ہے۔“ اسے آج پہلی بار غصہ آیا تھا۔

”دیکھیں اللہ رحمان ہے۔ رحیم ہے محض آپ کو ایک چھوٹی سی بات پہ دونوں میں نہیں ڈالے گا کہ آپ نے برقعہ کیوں نہیں لیا، نقاب کیوں نہیں پہنا۔“

دیکھیں میں روشن خیال بھی ہوں اور مذہبی بھی ہوں مگر میں مذہبی جنونی نہیں ہوں۔ آپ نے اگر ہاف سیلوں پہنی ہیں۔ فنگ کی شرٹ پہنی ہے۔ ساڑھی پہنی ہے، ہائی نکل پہنی ہے، بلی آپ کے لیے ہیں تو وہ نظر آنے چاہئیں یہ نہیں کہ آپ پتھپا کر رکھیں۔ انہیں ظاہر کر سکیں۔“

”مجھے اپنی خوب صورتی کو ظاہر کرنے کا شوق نہیں ہے۔“ حوریہ جواباً غصے سے بولی جس کا احساس ڈاکٹر آفتاب کو بخوبی ہو رہا تھا۔

”ارے میں تو مذاق کر رہا تھا آپ سے۔ آپ تو برا مان گئی ہیں۔“

”جیسی کوئی بات نہیں ہے۔“ حوریہ نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی۔
 ”میں نے وہ گھر تقریباً پسند کر لیا ہے آپ کے لیے۔ لیکن شادی کے فوراً بعد آپ کو اس گھر میں لے کر نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ کچھ دن آپ نے میری فیملی کے ساتھ گزارنے ہیں۔“
 اس بات پر وہ خاموش رہی۔

”میں نے ہر چیز کا مالک آپ کو بنا دیا ہے اپنے گھر، ہسپتال، اپنے بینک بیلنس تک۔ کابھی۔ میرے پاس جو کچھ ہے سب آپ کا ہے۔ بیٹے اور دونوں بیٹیوں کو میں ان کے حصے دے چکا ہوں اب باقی سب آپ کا ہے۔“

”آپ کا بینک بیلنس کتنا ہے امیر لوگو! کتنی جائیداد ہے؟“ ڈاکٹر آفتاب اسے چھیڑ رہے تھے۔
 حوریہ ہر دماغ ان کے کچے کے سحر سے آزاد ہوئی۔

”بابا جان کی میں انکوئی اولاد ہوں اور ان کا سب کچھ میرا ہے۔ لیکن کیا فائدہ۔ میرے والدین زندہ ہوتے تو میں حقیقی معنوں میں خوش ہوتی۔ میرے لیے زمین، دولت، جائیداد کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“ ڈاکٹر آفتاب اس پر ہنسی اڑا رہے تھے۔

”آپ کے لیے یہ دولت، جائیداد اہمیت نہیں رکھتی مگر میرے لیے تو رکھتی ہے نا۔ میرا مطلب ہے میرے ہسپتال اور مشن کے لیے آپ بھی انسانی فلاح پر خرچ کریں۔ آپ کے لیے یہ عہدہ جاری ہو گا اور آپ کے والدین کی روح بھی خوش ہوگی۔“

”آپ کو ایک بات چاہوں کچھ روز پہلے ایک بچی نے مجھ سے رابطہ کر کے رونا کر مجھے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اور کہا کہ آپ مجھ سارا دے دیں شادی کر لیں مجھ سے اور میں نے ایک بہت اچھے نوجوان سے اس کی شادی کر دئی۔ یہ نہ کہ میرے ذہن میں اس وقت آپ تھیں کہ اس بچی کو اور اچھے رشتے مل جائیں گے مگر آپ کو شاید نہ ملیں۔ آپ کو تحفظ اور سارا دینے کی نیت سے میں نے کسی اور طرف ہاں نہیں کی

حوریہ کے ایک دم سے آنسو نکل آئے۔
 ”ڈاکٹر صاحب تمہیں کس سوچ کہ آپ نے مجھ جیسی کم مایہ حیثیت لڑکی کو اس قابل سمجھا۔ آپ تو آسمان ہیں۔ میں عام سی لڑکی ہوں۔ عافیہ بھابھی نے شروع سے ہی نا محسوس انداز میں مجھے میری حیثیت سے آگاہ کر دیا تھا کہ میں کیا ہوں میں اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں میری عمر اٹھائیس سال سے زیادہ ہے اور اس عمر میں ہمارے گاہکوں کی لڑکیاں دو تین بچوں کی مائیں بن چکی ہوتی ہیں۔ میں ان کی بد نصیب ہوں۔ چھوٹی سی تو تھی جب اسی فوت ہوئی۔ اس کے بعد بابا جان بھی ساتھ چھوڑ گئے پھر بھوپھو کا سارا بھی چھین گیا۔ میں اب بے گھر اور بے در ہوں۔“ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کا دھیما دھیما لہجہ اس کے زخموں کو سی رہا تھا۔

”آج کے بعد نہ تو آپ بے سارا ہیں نہ بے در اور نہ بے گھر ہیں۔ نھیک ہے لڑکی کے ساتھ رنجیدی ہو جائے تو اسے پھر اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔ ہمارا معاشرہ وہ ایسا ہے وہ کچھ سال کے بوجھ کی حاملہ لڑکی سے شادی قبول کر لیتا ہے مگر ایک واضح غلطی لڑکی کی سستی کنوارے لڑکے سے شادی ہضم نہیں کرتا اور نہ کنوارا رشتہ ملتا ہے۔“

”کیوں ڈاکٹر صاحب؟ میری عمر اتنی زیادہ تو نہیں ہے۔“ وہ پھٹ پڑی۔ ”حوریہ بی بی! ہمیں معاشرے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔“ میرے گھر آکر آپ کو کوئی دیکھ نہیں ملے گا پھر بھی اس کے باوجود میں آپ کو فورس نہیں کرنا کہ آپ مجھ سے ہی شادی کریں۔ میں آپ کے لیے آپ کی عمر کے مطابق کسی اچھے نوجوان کا رشتہ دے سکتا ہوں۔ آپ کی اجازت ہو تو؟“

”نہیں ڈاکٹر صاحب! جب تقدیر میں یہی لکھا ہے تو مجھے انکار نہیں ہے۔“ وہ اب رُسکون ہو چکی تھیں۔

”مجھے یہ اعتماد کرنے کا شکر ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤں آپ کو کہ ایسے رشتے چل نہیں پاتے۔ جو معاشرے کے اصول و قوانین کی غمی کی بنیاد پر استوار

کیے جاتے ہیں۔ آپ نے درست فیصلہ کیا ہے بلکہ تقدیر کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ جو آپ کے حق میں بہترین ثابت ہو گا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر کے فون بند کر دیا۔

اسکارف سر پہ لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ میرے انتخاب کو دیکھیں۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب دیکھوں گی۔“ حور نے بحث نہیں کی۔

”ایک اور بات کہ میں نے اپنا فرقہ بدل لیا ہے اور اسی فرقے کی وجہ سے میں نے بہت سے روحانی اندازن طے کیے ہیں۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو پتہ ہے اور میں نے آپ کو بتائی ہے آپ کو اعتراض تو نہیں ہے؟“ وہ چپ سی ہو گئی۔

رات ابھی تنہائی کی پہلی رات ہے اور میری جانب اپنے ہاتھ بڑھاتی ہے سوچ رہی ہوں ان کو تحاموں

زیادہ تر سناٹوں کے تہہ خانوں میں اتروں یا اپنے کمرے میں ٹھہروں چاند مری کھڑی پہ دستک دیتا ہے!

عافیہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ ان کی واپسی رات کو ہی ہوئی تھی۔ حیدر بھائی ان کے ساتھ تھے اور حنا اپنے آپ میں تھکا۔ حور نے وی لاؤنگ میں لی وی دیکھ رہی تھی۔ جب ڈور بیل بجتی چلی گئی۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ حور نے اندر سے نکلی کہ اس وقت کون آگیا۔ ڈاکٹر آفتاب کو دیکھ کر اسے خوشنوار حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس جمعہ کو نکاح تھا اور وہ ہرگز نہیں توقع کر رہی تھی ان کی آمد کی۔ حور نے بڑا تنگ دم میں لا بٹھایا۔ اس دوران وہ بھرپور نظروں سے اس کا جائزہ لے چکے تھے۔ آج حور نے ان کی آمد پہ اپنا منہ نہیں پھینچایا تھا لیکن دیکھنے پہلے کی طرح اس نے اچھی طرح سر اور باقی جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔

اوہراوہر کی باتوں کے دوران ڈاکٹر آفتاب کا انداز اچانک بدل گیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ شادی کے بعد آپ اس پردے دروے سے جان چھڑالیں یا اس طرح کریں کہ صرف

حیدر اور عافیہ سر پکڑے بیٹھے تھے نکاح میں صرف کل کا دن باقی تھا اور ڈاکٹر آفتاب نے اپنی مجبوری بتا کر بیسوں کی ڈیمانڈ کی تھی۔ انہوں نے حیدر کو فون کیا تھا کہ میں نے کسی کا بہت ضروری احوار دینا ہے۔ مجھے تین کروڑ فوری احوار چاہیں یا آپ مجھ سے آدھا ہسپتال خرید لیں میں اس وقت بہت مشکل میں ہوں۔“

”میں نے حیدر کو بہت تاکید کی تھی کہ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہنی چاہیے۔ آپ نے اپنی بیگم کو بھی نہیں بتائی۔ میری برسوں کی عزت اور بنی بنائی ساکھ کا سوال ہے میں یہ جیسے بہت جلد لوٹا دوں گا۔“

لیکن حیدر سے رہا نہیں گیا اس نے یہ بات عافیہ کو بتادی اور وہ بہت پریشان تھی۔

”اب سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کیا جائے“ اتنے بیسوں کا انتظام فوری طور پر کہاں سے کیا جائے۔“ حیدر اضطراری انداز میں ٹپل رہا تھا۔

”صاف بات کہہ دیں کہ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ ہم کہیں سے دیں۔ آپ بات تو کریں ان سے۔“ عافیہ کا مشورہ اس کے دل کو لگا۔

حیدر اسی وقت ڈاکٹر آفتاب کی طرف چلا گیا اور عافیہ کے الفاظ من و عن و ہر ایسے۔ جس کے بعد ان کا رویہ بہت غیر متوقع تھا۔

”میری مجبوری بہت شدید ہے“ خیر اس طرح کرتے ہیں کہ شادی تھوڑی لیٹ کر دیتے ہیں۔ سال چھ ماہ میں جیسے ہی میرے حالات ٹھیک ہوتے ہیں میں آپ کو بتا دوں گا۔ میں سفید پوش آؤں ہوں اور اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہوں فی الحال میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“

ڈاکٹر آفتاب کا شاندار حرار اور منگنی منگنی پورچ میں کھڑی گاڑیاں حیدر کے تصور میں زندہ ہو گئیں۔

اب مزید بات کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ واپس چلا آیا۔ عافیہ نے خوب شور مچایا۔ ”پرسوں نکاح ہے سب کو پتہ ہے اب ہم کیسے لیٹ کریں؟“ اس کی پریشانی بجا تھی۔

حور نے کے سامنے ہی تو سب ہو رہا تھا۔ وہ کیسے لا تعلق رہ سکتی تھی۔

وہ خود بھی پریشان تھی اسے رات کا انتظار تھا کیونکہ ڈاکٹر آفتاب اس وقت فارغ ہوتے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب! میں یہ کیسا سن رہی ہوں؟“ اس نے حیدر کو دھکی کر اپنے کمرے کے بجائے صاف کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ شادی لیٹ کر رہے ہیں۔ میرے سب رشتہ داروں کو پتہ ہے۔ ہماری عزت کا سوال ہے یہ۔ پہلے آپ نے خود ہی دس دن کے اندر شادی کرنے کا کہا“ اب تو آپ یہ بات کر رہے ہیں۔“ وہ اچھی خاصی غصے میں تھی۔

”دیکھیں حور یہ لی لی! میں بہت پریشانی میں ہوں۔ میرے پاس ایک ٹکا ٹنک نہیں ہے۔ میرا بیٹا ڈاکٹر انجم امریکہ جانا چاہ رہا ہے۔ صرف میری وجہ سے رکا ہوا ہے۔ اس ہسپتال میں اس نے بھی انوسٹمنٹ کر رکھی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا حصہ دے کر باقی ہسپتال آپ کے نام کر دوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا یہ خیال کرے کہ میں نے شادی کر کے فی دینا بسائی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ فی الحال شادی کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا جائے۔“

”آپ کو کتنے بیسوں کی ضرورت ہے؟“

”فی الحال تین کروڑ روپے سے کام چل جائے گا۔ یہ مل جائیں تو میں آپ کو عزت سے اپنے گھر لے آؤں گا۔ میری پریشانی ختم ہو جائے گی اور آپ کو آپ کا مقام مل جائے گا۔“ ڈاکٹر آفتاب کے لہجے میں ایک دہشت زدہ انداز دوبارہ رواں ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔“ حور نے انہیں اسکی دے کر فون بند کر دیا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے اسی وقت ملائکہ کا نمبر ملا لیا۔ چوتھی ٹپل پر ہی اس نے ریسیو کر لیا۔

ماری تفصیلات سننے کے بعد وہ خاموش سی ہو گئی۔ بولی بھی تو بہت دیر کے بعد۔

”حور یہ! مجھے تو ڈاکٹر آفتاب ٹھیک تو ہی نہیں لگتے، ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو مگر پھر بھی تم سوچ کر فیصلہ کرو۔ یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اور سچ پوچھو تو میں اس پر شے کے حق میں نہیں ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کریں گے ورنہ وہ بیسوں کا مطالبہ شادی کے بعد تم سے کرتے اس وقت تم انکار نہ کر سکتیں، پہلے مطالبہ کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ صرف پیسے چاہتے ہیں۔ تمہیں انہیں یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ تمہارے نام دولت جانیڈا ہے۔“

”یہ میں نے نہیں بتایا۔ پچھو پچھو نے جب انہیں میرے بارے میں بتایا تو ان کے منہ سے نکل گیا تھا کہ میں اپنے والد کی جائیداد کی اکلوتی وارث ہوں۔“

”چلو تم ایک کام کرو۔ تمہیں ڈاکٹر آفتاب کی نیت کا پتہ چل جائے گا۔“ ملائکہ اسے آئندہ کا لائحہ عمل بتاتی چلی گئی۔

فجر کی نماز کے بعد اس نے بہت دیر تک غامض انداز سے روٹی اور امید مانگی۔ جب وہ منہ مٹا کر کے انہی تو بہت حد تک پرسکون تھی۔ رات والی پریشانی بھی کم تھی۔

نوبت کے قریب اس نے عافیہ سے اپنی ایک سہلی کے گھر جانے کی اجازت مانگی جو قریب ہی دوسرے بلاک میں رہتی تھی۔

انہوں نے بھلا کیا کہنا تھا۔ سو حوریہ گھر سے نکل کر سیدھی ڈاکٹر آفتاب کے ہسپتال جا پہنچی۔ ڈاکٹر آفتاب کی خیر و سیکرٹری نے حسب معمول کھلی نظروں سے اسے دیکھا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر آفتاب کے ساتھ ان کا بیٹا بھی موجود تھا۔ دونوں اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوئے۔

”ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو تین کروڑے دوں گی مگر بینک سے اتنا لمبا ڈنٹ چھ اتنا جلدی نہیں ملے گا آپ کو کچھ دن انتظار کرنا ہو گا۔“

”اوہ۔ بسم اللہ۔ آپ بیٹھیں تو سہی یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا اسے۔ ابھی آپ کی باتیں ہی ہو رہی تھیں۔ یہ کہہ رہا تھا کہ ہسپتال مکمل طور پر آپ کے سپرد کر دیا جائے۔ پھر آپ جائیں آپ کا کام۔“

ڈاکٹر آفتاب کا انداز ہمیشہ کی طرح دل کش تھا۔ بیٹھی نہیں اور ان ہی قدموں گھر واپس لوٹ آئی۔

مانفک کی ہدایات پر اس نے عمل کر لیا تھا۔

گھر آکر اس نے ڈاکٹر آفتاب کا نمبر دیا جو بڑی دل رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد خود ہی ان کی کل آئی۔

”ڈاکٹر صاحب! میں جو آپ کو پیسے دوں گی اس کا ذکر میرے گھر کے کسی فرد کے سامنے نہیں کرنا ہے۔“

”نہیں کروں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی عزت میری عزت ہے جس پر کسی صورت میں حرف نہیں آنے دوں گا۔“ ان کا لہجہ شہد آگیا تھا۔

”اگر اس لین دین کا حیدر بھائی یا کسی اور کو پتہ چل گیا تو ہماری شادی نہیں ہو سکے گی۔“

”آپ بالغ ہیں غافل ہیں اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہیں کوئی آپ پر پابندی نہیں لگا سکتا۔ ایسا کچھ ہوا تو آپ میرے پاس آجائے۔ ہم کورٹ میں

شادی کر لیں گے۔ آپ بجاوت کریں اس معاشرے کے فرسودہ قوانین کے خلاف۔“ ڈاکٹر آفتاب پورے جوش میں آچکے تھے۔ دوسری طرف حوریہ کے لبوں پہ پھیلی سی مسکراہٹ آگئی۔

”میں اگر پیسے لے کر آپ کے پاس آ جاؤں تو آپ مجھے کہیں رکھیں گے؟“

”ارے دنیا بہت بڑی ہے حوریہ جی! کہیں بھی اپنی دنیا بسالیں گے۔ یا پھر آپ شروع کے کچھ ماہ ہسپتال کے وی آئی بی رومز میں گزار لیتا۔ اس کے بعد میں آپ کو گھر لے جاؤں گا۔“

”مطلب آپ مجھے فوری طور پر گھر لے کر نہیں جائیں گے۔“

”نہیں۔ ایک دوسرے سے نہیں کیونکہ کچھ قابض ہیں پھر کبھی بتاؤں گا آپ کو۔“ وہ بڑی صفائی سے ٹال کر اپنے مطلب کی طرف آگئے۔

”حوریہ! آپ کی گاڑی والی جو حویلی ہے اس کی کیا مالیت ہوگی اس وقت؟“

”مجھے نہیں پتا۔ تو مزید بڑی ہوئی ہے۔ حیدر بھائی حین بھی جانتے ہیں خیر خیر کو۔“

”اچھا آپ اس حویلی کو بھی فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دیں کیونکہ میں نے شروع میں بھی آپ سے کہا تھا کہ انسانی بھلائی کے کاموں میں تن من دھن سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب! آپ کچھ کہیں اور میں ناکروں یہ ہو نہیں سکتا کیونکہ آپ واقعی مجھے اچھے لگتے گئے ہیں۔ میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ اتنی دولت جائیداد میرے کس کام کی؟“

”ارے ارے۔ ایسا نہ کہیں ہمارا سب کچھ آپ کا ہے۔ میں شام کو آؤں گا۔ آپ کی فیملی سے ملوں گا اور بتاؤں گا کہ نکاح جمعے کو ہی ہو گا۔“

ڈاکٹر آفتاب سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا مارے خوشی کے وہ ناچ اٹھیں گے۔

حوریہ نے جب فون بند کیا تو اس کی آنکھوں میں

ہونٹے مویٹے آنسو تیر رہے تھے۔ اسے جو کچھ جانتا تھا جان چکی تھی اور سچ حقیقتوں کی سفاکیوں نے اسے آبدیدہ کر دیا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب، اپنے بھائی، بیٹے اور دونوں بیٹیوں سمیت ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ پیسوں کا انتظام ہو گیا ہے اور شادی جمعہ کو ہی ہوگی۔ اس وجہ سے حیدر اور عافیہ کے دل میں جو بلی آیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ منجانی میک، کلب رول سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔

”ہم پھر کل کس وقت آئیں اپنی امانت لینے؟“

ڈاکٹر آفتاب کے بھائی نے براہ راست حیدر سے پوچھا۔ اس وقت تک حوریہ ڈرائنگ روم میں پہنچ چکی تھی۔

سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ جو بڑی سرد اور اجنبی نگاہوں سے آنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں شرم و حیا کا شعلہ لگتا تھا۔

”آپ کو کل آئے کی ضرورت نہیں ہے یہ گھر آئے۔“

مجھے اس شادی سے انکار ہے۔

اپنی بات مکمل کر کے سب کے حواسوں پر بم گرا کر وہ رکی نہیں جس طرح آئی تھی اسی طرح ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

عافیہ بھائی اور حیدر بھائی دونوں اسے دیکھ رہے تھے۔ عافیہ کی تو دلی مراد پوری ہو رہی تھی۔ دل سے وہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ حوریہ کی شادی ڈاکٹر آفتاب سے ہو۔

جب سے اسے حوریہ کی مالی حیثیت کا علم ہوا تھا اس کے خیالات میں راتوں رات تبدیل آئی تھی۔

آج حوریہ کے انکار کی سب سے زیادہ خوشی اسے ہی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں اپنے بھائی راشد کا نام تھا۔ جو حوریہ سے عمر میں سترہ اٹھارہ سال بڑا تھا۔ شراب اور جوئے کی لت کی وجہ سے کبھی کوئی کام تک

کر اس نے کیا ہی نہیں تھا دس دن یہاں تو دس دن وہاں۔ وہ مستقل نوکری کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان ہی حرکتوں کی وجہ سے ابھی تک اس کا رشتہ نہیں ہوا تھا۔

عافیہ اس بھائی کی وجہ سے بہت پریشان رہتی تھی۔ وہ دل سے چاہ رہی تھی کہ حوریہ کے ساتھ راشد کی شادی ہو جائے۔ کیونکہ ایسی صورت میں راشد کی زندگی بن جاتی تھی۔ حوریہ کا سب کچھ راشد کا ہو جاتا تو وارے نیارے ہو جاتے۔

حوریہ کی سان لوجی کے پیش نظر اسے مکمل امید تھی کہ وہ ماں جائے گی۔ کیونکہ ان دنوں روز سے ہی اسے اس گھر میں حوریہ کا وجود ناقابل برداشت لگتا تھا۔ حوریہ کی اچھی بھلی متوازن شخصیت کو سچ کر کے اس نے احساس کسری کے بوجھ تلے دبا ڈالا تھا۔ اس کی عمر اور شکل کو اس نے خاص طور پر ٹارگٹ بنایا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر آفتاب کے رشتے کو ناپسند کرنے کے باوجود دور اضی ہونے پر مجبور ہوئی تھی۔

حیدر تو باہر نکل گئے تھے عافیہ وہیں تھی۔

اپنے اس اتوار کو نسا اور حنان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو رہی ہے میں چاہ رہی ہوں کہ تمہارے اور نسا کے فرض ہے اکٹھے ہی مہرہ بر آہو جاؤں۔ میری کتب سے آرزو تھی تمہیں بھابھی بنانے کی جو قسمت سے اب پوری ہونے جا رہی ہے۔“ عافیہ کے الفاظ لہجہ انداز سب کچھ ہی بدلا ہوا تھا۔

حوریہ خاموشی سے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔

”بھابھی! میں سوچ کر جواب دوں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے رخ موڑ لیا جیسے اب کوئی اور بات کرنا ہی نہ چاہتی ہو۔

”ضرور سوچو لیکن جواب ہاں میں ہونا چاہیے۔“

عافیہ بھابھی کا انداز بہت شرارتی تھا۔ حوریہ کے اندر آج ایک اور بت ٹوٹا تھا۔

عجب لوگ ہیں ہم اہل اعتبار کتنے بد نصیب لوگ ہیں جو رات جاگنے کی تھی

جو کہیں جیتے کا تھا وہ کہیں ہارتے رہے

فہ آج بھی صبح سے شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھی۔
اس نے حور پہ سے بھی کہا کہ تم بھی چلو اپنی شاپنگ
کرو گھر و نہ مانی۔

حنان اسے کھانا پانے کا کتنے آیا تو وہ دانا کد سے ہی

پہلے اس نے کوئٹہ ڈرنکس جتن کے ہاتھ اندر
بجھوائی۔ پھر کھانا بنانے میں لگ گئی۔ کباب اور مرغی
فریزر میں پڑی تھی سو چاول بنانے اور کباب فرائی
کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ساتھ اس نے سالے
دار چکن بنالیا۔

دوبارہ اس کا سہل بچنے لگا تو ناچار وہ کمرے کی طرف
ڑی۔ چانے کس کو اتنی جلدی تھی۔

”خوریہ! اٹھ! خود کو اور اسارت سمجھتی ہو تم نے
 رہے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر کے بہت بڑی
 کی کی ہے۔ تمہیں پتہ نہیں کہ میں کون ہوں اور کیا
 ۔۔۔

س کا پورا جسم ایک دم بے جان سا ہو گیا۔ عہد
نے جس خوف کا اظہار کیا تھا وہ سچ ہو گیا تھا۔

[illegible]

اس وقت حور یہ اپنی نسوانی انا کو فراموش کر چکی تھی۔ ”کریں گے ہاں مبری مدد۔ کریں گے ہاں شادی۔“ اس کی آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھیں سرگرم آکا پتا وجود اور اللہ کا نام، انسانیت کا واسطہ سیر افکار کو بے اختیار سر ہلانے پر مجبور کر گئے۔

✻ ✻ ✻
 حور یہ کو بہت تیز بخار تھا۔

ملک شجاعت حیدر سے کہہ رہے تھے کہ ہمیں
شادی جلدی کرنی ہے بلکہ شیر افکن نے تو حکن سے
صاف کہہ دیا تھا کہ تمہاری بارات کے دوسرے دن
میں اپنی بارات لاؤں گا۔“

حیدر اپنی بچڑی میں اسی وقت سٹھائی لینے نکلا اور
 حتمی نے یہ خوش خبری عافیہ بھانپھی کو سنائی۔ یہ سن کر

شیراقلن کا رشتہ آیا ہے حوریہ کے لیے۔ عافیہ بھابی کا چرا جس طرح اترتا تھا۔ وہ حنان سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہوں نے اپنے غصے کو مسکراہٹ کی آڑ میں چھپایا ہے۔

حنان کو اپنی خوشی پہ قابو نہیں تھا۔ ملک شجاعت نے حوریہ کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حنان اس کے کمرے میں آیا۔ وہ عدھال سے انداز میں بستر پر دراز تھی۔ زرد رنگت اتر چرا۔ چند دن میں ہی اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔

”حوریہ! میرے دوست شیراقلن کے دادا جان آئے ہیں۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ادھر ہی لے آؤں کہ ڈرائنگ روم میں آؤ گی؟“ حنان نے اپنی شریر مسکراہٹ کو سنجیدگی کی آڑ میں چھپا لیا تھا۔ حوریہ ہڑبڑاسی گئی۔

حنان کے دوست کے سامنے شدت جذبات میں کی گئی ہے وہ قہری کو وہ اپنے تئیں بھول گئی تھی اور بار بار اس پر دل کھول کر شرمندہ بھی ہوئی تھی کہ اس نے کیسی حماقت کر دی ہے۔ حنان کا دوست کیا سوچتا ہو گا۔

”بھابی! لیکن میں ہیں چائے لائیں تو تم بھی جلدی سے ان کے ساتھ آؤ۔ وہ تمہیں دیکھنے آئے ہیں۔“ حنان باہر جا چکا تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہو چکا ہے۔

عافیہ کے پیچھے پیچھے وہ ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ ملک شجاعت نے اُنہی کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اسے نہ جانے کیوں روتا آگیا۔ روتی روتی آنکھیں زرد رنگت جھکی نگاہیں اور کمزور سی آواز۔ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ یہ لڑکی کی پریشانی اور خوف کا شکار ہے۔ ملک شجاعت کی نگاہوں میں حوریہ کے لیے پسندیدگی تھی۔

حیدر انہیں حوریہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے۔

مما اور بھیا کو کنوینس کرنے کا مشکل مرحلہ شجاعت ملک کے ذریعے ہی طے ہوا تھا۔ وہ وضع دار انسان تھے

حیدر بہت خوش تھا۔ ربا حنان تو اس کی شیراقلن سے دوستی رشتہ داری میں بدل رہی تھی اس کے لیے یہ مقام شکر تھا۔

ملک شجاعت بہت جلدی شادی کرنا چاہ رہے تھے کیونکہ شیراقلن کی جلدی جلدی کی رشت نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ وہ تو پھیلنے پہ برسوں جمانے کی فکر میں تھا۔ ان کے سامنے اس نے یہی کہا تھا کہ اسے حوریہ سے شدید محبت ہے جو پیل دو پیل کی نہیں ہے بلکہ برسوں پہ محیط ہے۔ اس کی بھابی زبردستی اس کی شادی اپنے بھائی سے کرنا چاہتی ہے جو کہ اسے گوارا نہیں ہے۔

حوریہ کو دیکھ کر اس سے مل کر ان کے دل سے سب ملال رخصت ہو گیا تھا۔

حیدر نے ہاں کر دی تھی۔ حنان کی وجہ سے عافیہ کو بھی اپنی تائید دینی ظاہر کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ طو غاؤ کر رہا ”حیدر اور حنان کی خوشی میں وہ خوش تھی۔ آج حنان کے دل پہ بھی رکھا بوجھ سرک گیا تھا۔

حوریہ اور ذاکر آفتاب کے رشتے کے بعد وہ خود کو مجرم تصور کرتا تھا۔

ملک شجاعت بھی بوکھلائے ہوئے تھے مگر صدمہ شکر کہ یاسمین اور عبداللہ ملک آرہے تھے انہیں چار دن بعد کی سیٹ ملی تھی۔

ملک شجاعت نے انہیں سمجھا بھالیا تھا۔ پہلا بیٹا تھا۔ ان کے آکلن میں کھلنے والا پہلا پھول اس کے بارے میں یاسمین نے بڑے خواب دیکھے ہوئے تھے۔ خیران دونوں میاں بیوی نے اس بات کو اتنا کامسلہ نہیں بنایا اور معاملات خوش اسلوبی سے طے کر لیے۔

حیدر نے عافیہ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ حوریہ کی گزشتہ زندگی کی ٹریجڈی کوئی الوقت شیراقلن کی فیملی کے سامنے شیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اپنے طور پہ اس نے اکیلے میں یہ بات صاف صاف شیراقلن کو بتا دی تھی کہ کل کو اس بات سے اسے

حیدر نے عافیہ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ حوریہ کی گزشتہ زندگی کی ٹریجڈی کوئی الوقت شیراقلن کی فیملی کے سامنے شیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اپنے طور پہ اس نے اکیلے میں یہ بات صاف صاف شیراقلن کو بتا دی تھی کہ کل کو اس بات سے اسے

اعتراف نہ ہو۔ اس نے من کر کسی خاص روز عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ فی الحال میری فیملی کے سامنے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں خود مشکل کر لوں گا۔“

یاسمین اور عبداللہ ملک پاکستان پہنچ چکے تھے۔ ادھر حوریہ بہت پریشان تھی۔ ذاکر آفتاب کی کال پر بیٹو کرنا اس نے چھوڑ دی تھی وہ دھمکی آمیز میسج بھیجنے لگے تو اس نے گھبرا کر موبائل ہی آف کر دیا۔

یاسمین اور عبداللہ ملک دونوں جا کر حوریہ سے مل آئے تھے۔ بیٹے کی پسند کو انہوں نے دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔

حنان کے ولیمہ کے ٹھیک بارہویں دن شیراقلن اور حوریہ کا نکاح تھا۔

دل و نگاہ یہ کس طور کے عذاب اترے وہ بات بھابی اتراتی اس کے خواب اترتے تھے۔ حنان وہ رشتہ کے چھینوں پہ آفتاب اترتے تھے۔

زمانہ بیت گیا ان کے آب و تاب اترے اور اس شب میں کڑی دھیر کے لحوں میں کوئی چراغ کوئی صورت گلاب اترے کبھی تو ترے لہجے کی شبیہی ٹھنڈک سماعتوں کے درپچوں پہ خواب خواب اترے

شادی سے صرف دو دن پہلے شیراقلن کے دونوں چھوٹے بھائی بھی پاکستان آگئے تھے۔ بھائی کی شادی کی بہت خوشی تھی انہیں۔ ان کی طرف تو بہت بنگامہ اور رونق تھی لیکن حوریہ نے حیدر بھائی اور عافیہ سے کہہ دیا تھا کہ شادی میں زیادہ لوگوں کو نہ بلایا جائے اور نہ ہی رسوں کے نام پر ہلاک کیا جائے۔ عافیہ نے تو شکر کا سانس لیا تھا کہ اخراجات میں کمی جو ہو رہی تھی۔ مگر حیدر اور حنان جڑ بڑ ہو رہے تھے کہ شیراقلن کی فیملی کیا سوچے گی۔ حوریہ نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے سے انکار کر دیا۔ اتنی ضدی وہ پہلے کبھی نہیں

کرنا تھا کہ شادی میں زیادہ لوگوں کو نہ بلایا جائے اور نہ ہی رسوں کے نام پر ہلاک کیا جائے۔ عافیہ نے تو شکر کا سانس لیا تھا کہ اخراجات میں کمی جو ہو رہی تھی۔ مگر حیدر اور حنان جڑ بڑ ہو رہے تھے کہ شیراقلن کی فیملی کیا سوچے گی۔ حوریہ نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے سے انکار کر دیا۔ اتنی ضدی وہ پہلے کبھی نہیں

تھی۔ اصل بات سے آگاہ کر کے وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے ذاکر آفتاب کی مجرمانہ ذہنیت کا خوب اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اس کی وجہ سے حنان یا حیدر بھائی کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔

حوریہ کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ ملائکہ سچ سچ اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی۔ یقین آتے ہی وہ بھاگ کر اس سے لپٹی تھی۔

”تم بات نہ کرو مجھ سے۔ اتنی اہم بات بتانی تم نے گوارا نہیں کی۔ وہ تو بھلا ہو حنان بھائی کا جنہوں نے مجھے بتایا تمہاری شادی کا۔ تمہارا سیل نمبر اتنے دنوں سے آف ہے میں نے لینڈ لائن نمبر لڑائی کیا تو حنان بھائی سے بات ہوئی۔ انہوں نے ہی سب کچھ بتایا مجھے اور میں نے اتنی مشکل سے سیٹ ریزرو کروائی۔“ ملائکہ کے گلے شکوے جاری تھے۔ حوریہ شرمندگی سے مسکرا رہی تھی۔

ملائکہ کی آمد نے اسے حقیقی معنوں میں خوشی بخشی تھی۔

وہ بھی مناشا کے ساتھ پارلر سے مہندی لگوا کر آئی تھی۔

مناشا کی شادی کو چند روز ہی ہوئے تھے وہ سر سے پاؤں تک سوری بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ضد کر کے اس نے حوریہ کے پورے کے پورے بازوؤں اور پاؤں پہ ٹخنوں سے اوپر تک مہندی لگوائی تھی۔ وہ حنان کے ساتھ بہت خوش تھی۔ عافیہ کے برعکس وہ من موچی اور شوخ مزاج تھی۔ عافیہ کی طرح اس نے حوریہ اور شیراقلن کی شادی کو اتنا کامسلہ نہیں بنایا تھا۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی اس نے حوریہ کو بولی سیلون لے جانا شروع کر دیا تھا۔ حوریہ کے بل کمرے نیچے تک جاتے تھے مگر ایک شیب میں نہیں تھے نیچے سے اس کے پاؤں کی تھوڑی سی کنگھ کر اس نے حوریہ کے لیے گھنے براؤن بالوں کو خوب صورت شیب دلوادی تھی۔ حوریہ نے خود پہ آج سے پہلے تک توجہ نہیں دی

کی مرزا بھائی اس سے پہچان رہی تھی۔

رات ملائکہ اور وہ جاگتی رہیں۔ کتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ باتیں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ رات کا آخری سہر تھا جب آسمان پہ بادلوں کی قطاریں جمع ہوئے شروع ہوئیں۔

”ملائکہ! تمہیں پتا ہے مجھے رنگوں سے کتنی دلچسپی تھی میٹرک کے بعد میں کتنے شہخ شہخ رنگوں کے کپڑے سلواتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ رنگوں کو اپنی منہمی میں بند کر لوں۔ نیلے، پیلے، سرخ، آدے، گلابی، پیلے، کاسنی، گولڈن، سبز میں قوس قزح کے سب رنگ چرائوں اور پھر رنگوں کی بارش میں نہاؤں۔ مگر میرے شوق کی عمر بہت کم تھی۔ بہت ہی کم۔“

اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ملائکہ نے اس کا سر شانے سے لگا لیا مگر اس کے رونے کی رفتار میں کمی نہیں آئی۔

عمر کا جس روز گاڑی سے اہکسلنٹ ہوا میں نے اس روز مسخ جارحٹ کا سوٹ پہنا تھا بقول اماں فاطمہ کے میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔

پھر اسی دن سب رنگ مجھ سے چھین گئے۔ مجھ میں شاید شعور نہیں تھا تب ہی تو اس کے بعد عید پہ مندی لگانے لگی تو عورتوں نے مجھے ٹوک دیا۔ پھر پھوپھو مجھے یہاں لے آئیں اپنے ساتھ۔ غافہ بھابھی بات بات پہ مجھے ٹوک دیتی تھیں کہ یہ کپڑے نہ پہنو وہ رنگ نہ پہنو، گوچی آواز میں نہ ہنس، زیادہ باتیں نہ کرو، لوگ کیا کہیں گے۔ میں لوگوں کے ڈر سے آہستہ آہستہ خاموش ہوتی چلی گئی۔ پھوپھو مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں مگر اس تبدیلی اور اس خاموشی کو نہ سمجھتی، محسوس نہ کر پائیں۔

اور میرے سارے رنگ تیز دھوپ میں بے رنگ ہوتے چلے گئے۔ آج جب میں نے مندی لگوائی تو بار بار یہ گمان ہوتا رہا کہ ابھی کوئی مجھے ٹوک دے گا۔ ابھی کوئی روک دے گا۔“

ملائکہ نے کھل کر اسے رونے دیا۔ اتنے برسوں کی کڑواہٹ تھی اس کے اندر۔ اچھا تھا انکل جانی۔

شہر کے سب سے بہترین پارلر سے مناشا نے اس کے لیے اپائنٹ منٹ لی تھی۔ شیراقلن کی مہمانی حوریہ کے لیے عروسی سوٹ۔ بلڈ رید کلر میں تیار کروایا تھا۔ جو بہت سی خوب صورت تھا۔

ملائکہ نے شام اس کی رخصتی کے بعد اسامہ آباد چلے جانا تھا۔ وہ صرف چند دنوں کے لیے پاکستان آئی تھی۔

پاتی کے دن اسے اپنے میکے اور سسرال دونوں کے ساتھ گزارنے تھے۔

حوریہ کو رخصت ہو کر شیراقلن کے آبائی شہر چکوال جانا تھا۔ اچھا خاصا طویل سفر تھا۔ حیدر نے صرف چند قریبی رشتہ داروں دوستوں کو ہی مدعو کیا تھا۔ ملائکہ نے گلے لگا کر حوریہ کو بہت سی دعا میں دی تھی۔ رواج کے مطابق ادھر سے کوئی خاتون یا رشتہ دار لڑکی حوریہ کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ کیونکہ اس کے رشتہ داروں میں اب صرف اسی گھر کے چار نفوس تھے۔ بابا جان اور پھوپھو دو ہی۔ بہن بھائی تھے ادھر سے حوریہ کی ماں جی کی صرف ایک ہی بہن تھی جو بواہن عمر میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ یہی حوریہ کے رشتہ دار تھے۔

غافہ نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ مردوں کو جھلان معاملات یا رسموں سے کیا سروکار تھا۔ مگر اس کمی کو حوریہ نے اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

یا سکین بھی عورت تھیں۔ ان کی حساس طبیعت نے اس عام سی بات کو فوراً ”نوٹ کیا تھا کہ حوریہ کی طرف سے شادی والے معاملے میں اتنی خاموشی گری نہیں دکھائی گئی ہے۔ شیراقلن ان کی پہلی اولاد بھی اسی حوالے سے ان کے بڑے ارمان تھے۔ بیٹے کی ضد کے آگے وہ بار بار اپنی تمہیں مگر اندر ہی اندر انہیں بہت سی باتیں کھٹک رہی تھیں۔



گاڑی شیراقلن کا چھوٹا بھائی عادل ڈرائیو کر رہا تھا۔

اس کے ساتھ شیراقلن بیٹھا تھا جبکہ پچھلی سیٹ پر یاسمین اور حوریہ کے ساتھ عبداللہ ملک کی بھانج بیٹی تھیں۔ باقی گاڑیاں پیچھے تھیں۔ بارش کی وجہ سے عافل احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد بارش کے آثار کہیں بھی نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ عادل نے بھی رفتار بڑھا دی۔ کلر کمار پیچھے میں انہیں تین کے بجائے چار گھنٹے لگے تھے۔ ابھی مزید ایک گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ اور ہر بھی بارش کا سلسلہ زور و شور سے جاری تھا۔

عادل کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹا کر شیراقلن نے خود اس کی جگہ سنبھال لی حالانکہ ماما اور آئی نے بہت کہا کہ تم نہ کرو ڈرائیونگ مگر وہ نہ مانا کیونکہ عادل کی حالت وہ دیکھ چکا تھا۔ انگلینڈ اور پاکستان کی ٹریفک اور قوانین میں بہت فرق تھا۔ عادل گھبرایا ہوا سا تھا۔ کلر کمار پیچھے کے بعد شیراقلن نے گاڑی گھول جانے والی ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ اب وہ اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

اس دوران حوریہ کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ اتنا بھاری جوڑا اور اس پر سونے کی بھاری جیولری اور ایک اپ نے ستیا ناس کر دیا تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ جلدی سے گھر آجائے۔

یاسمین کو اس کی حالت کا بخوبی احساس تھا۔ جب ہی تو انہوں نے اس کا سراپے شانے پر رکھ لیا تھا۔ ان کا دایاں بازو حوریہ کی کمر میں جھانک رہا تھا۔ خدا خدا کر کے سفر تمام ہوا۔

ملک شجاعت، عبداللہ ملک اور آبان سمیت دیگر رشتہ داران سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔

حوریہ کو سب سے پہلے جوس پلایا گیا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ حالانکہ ملائکہ نے کتنی بار کہا کہ تھوڑا سا کھالو مگر اس نے بھوک نہ ہونے کا زور کر کے منع کر دیا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی یاسمین نے سب سے پہلے صدرے کے کمرے کو حوریہ کا ہاتھ لگوا دیا تھا۔ باقی کئی ریمیں کرنے سے عبداللہ ملک نے روک دیا تھا۔ کیونکہ حوریہ کی حالت سامنے تھی۔

شیراقلن کی ایک کزن نے اسے زبردستی نیم گرم دودھ پلایا اور پھر تقریباً "آدھے گھنٹے بعد اسے چمن برائی کھلائی۔

مٹھائی کی رسم کے لیے شیراقلن کو اندر حوریہ کے پاس لایا گیا۔ خاندان کی سب عورتیں اور جمع تھیں اور بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں شیراقلن نے حوریہ کو مٹھائی کھلا دی تھی اور کامیاب ٹھہرا تھا۔ جبکہ حوریہ کا ہاتھ باوجود کوشش کے اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس کا چہرہ گھٹکت کی آڑ میں تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔

اسے اندازے سے ہی یہ معرکہ سر کرنا تھا مگر اقلن بھی بہت ہوشیار تھا ناچار وہ گلاب جامن بھی حوریہ کو خود ہی کھانی پڑی کیونکہ اس رسم میں شرط یہی تھی جو مٹھائی کھلانے میں ناکام ہو جاتا ہے دوسرے کے جسے کی مٹھائی بھی خود کھانی پڑتی اور دونوں بار ہی ہوا۔

بھائی کی جیت پر عادل اور آبان نے خوب تائیاں بجا دیں۔ ان کے لیے یہ ریمیں بہت اونچکی اور چڑھائی تھیں۔ شیراقلن کا گھر فرسٹ فلور پر سیٹ کیا گیا تھا۔ یاسمین اسے تمام کراپ لائیں۔ ساتھ آبان اور عادل بھی تھے۔ جوں ہی انہوں نے شیراقلن کے بیدروم کا دروازہ کھولا اور حوریہ نے پہلا قدم اندر رکھا اس پر پھول برسنے لگے۔ فلورل ڈیکوریشن بہت زبردست تھی۔ یہاں وہاں اس کے قدموں تلے پھول ہی پھول تھے۔

دکھتے ہوئے گلاب کے سرخ پھول، کراپھولوں سے بھرا ہوا تھا۔

یاسمین نے اسے جمائی سا تزیین پڑھایا۔ جہاں پھولوں کی چادر سی پچھی ہوئی تھی۔

"تم اب آرام کرو۔" یاسمین نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور باقیوں کو لے کر نیچے چلی گئیں۔

حوریہ اب آرام سے کمرے کی آرائش دیکھ رہی تھی۔ ساری فضا گلاب کی خوشبو سے معطر تھی۔ پہلی بار اس کے لبوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ آئی مگر کچھ

سوچ کر دل بجھ سا گیا۔ اسے پتا تھا شیراقلن نے اس کی مدد کرنے کے خیال سے شادی کی تھی ایک لحاظ سے وہ اس کا محسن تھا کہ مشکل کی اس گھڑی میں اس نے نہ جانے کس طرح اپنے گھر والوں کو اس شادی پر راضی کیا تھا۔

اسے اس حقیقت کو بھولنا نہیں چاہیے کہ اس نے ایک بے بس لڑکی بجھ کر اس کی مدد کی ہے۔ گھنٹوں پہ سر پر رکھے رکھے بہت سال پیچھے اپنے ماضی میں پہنچی ہوئی تھی۔

یہیں تھا میرا بچپن، یہیں کہیں پہ تھا۔

یہیں رہا تھا

یہیں رہا تھا

یہیں درختوں کے سائے میں تھک کے سویا تھا

یہیں پہ کھیل تھے میرے

یہیں ٹھہر دے تھے

یہیں جوڑیوں سے نام کاڑھ لیتے تھے

یہیں چھوٹوں سے رنگ چھان لیتے تھے

یہیں چھوٹوں سے اپنی بہت چلتی تھی

کوئی بھی تھی جو ہر وقت ساتھ جاتی تھی

ان ہی جمہور کوں سے کچھ چاند بھانکتے تھے مجھے

یہیں تھا میرا بچپن

یہیں نہیں پہ تھا

حوریہ چار سال کی تھی جب عجمینہ جیمک نے

بہپاٹائس بگڑنے پر زندگی کو الوداع کہا تھا۔ بابا جان

نے اسے محبت سے پالا اور ماں باپ دونوں کا کردار ادا کیا۔

اماں فاطمہ کی بھرپور توجہ اور محبت بھی حوریہ کو میسر تھی۔ اماں فاطمہ اور پھر ان کے ماں باپ اور پھر ان کے

ماں باپ نے بھی اس خاندان کی خدمت کی تھی۔ اماں فاطمہ نو جوانی میں ہی یہ وہ ہو چکی تھیں۔ اولاد کوئی تھی

نہیں سو حوریہ ہی ان کی محبت کا مرکز تھی۔ انہوں نے

جوانی سے بڑھاپے کا سفر اسی جوبلی میں طے کیا تھا۔

حوریہ عمر کی منزلیں طے کرتی تھی۔ بابا جان کے بہت قریبی دوست چوہدری رفیق احمد تھے۔ ان کا جوبلی میں آزادانہ آنا جانا تھا۔ وہیں یہ حوریہ انہیں اپنے بیٹے کے لیے بھانجی۔ اپنی خواہش کا اظہار انہوں نے حوریہ کے بابا نعمان سے کیا۔ انہیں بھانجیا کی اعتراض ہو سکتا تھا۔

حوریہ میٹرک میں تھی جب چوہدری رفیق احمد کی شدید پیار بھری ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر امین نے اس کا نکاح عمر رفیق احمد سے کر دیا۔

اس وقت زہرا بیگم نے بھانجی سے بہت کہا کہ اتنی

جلدی بہت کرنا حوریہ بہت چھوٹی ہے فی الحال مستقلی

کرنا مگر وہ دوست کو مان نہ کر سکے۔ بڑی دھوم دھام

سے نکاح ہوا۔ رفیق احمد کی پوری برادری جمع ہوئی۔ مگر

اس خوشی کی عمر بہت مختصر تھی۔

نکاح کے بعد صرف دو ماہ کا عرصہ گزرا تھا۔ اس کے

بعد زندگی آزمائش بن گئی تھی۔

عمر رفیق احمد کا گاڑی سے بہت شدید ایکسیڈنٹ

ہوا تھا۔ دس دن وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا

رہنے کے بعد خاموشی سے دنیا چھوڑ گیا۔

نہیں تو عمری میں ہی حوریہ کی آزمائش کا دور شروع

ہو گیا۔ گاؤں دیہات کے لوگوں کا اپنا مزاج اور سوچ

ہوتی ہے۔ دے لفظوں میں عورتوں نے اسے منحوس

کہنا شروع کر دیا۔

رفیق احمد بیٹے کے دیکھ سے مدھال تھے تو قیامت

نعمان پر بھی ٹوٹی تھی۔ حوریہ کی عمر ہی کیا تھی جو اتنا بڑا

داع بھی لگ گیا تھا۔ لوگوں کی سوچ سمجھ تھی۔ اٹھتے

بیٹھے اس حقیقت کا احساس دلاتا بھولتے نہیں تھے۔

رفیق احمد نے وقت کے ساتھ ساتھ خود کو سنبھال

لیا۔ اس روز اس کی عدالت میں پیشی تھی۔ خاندانی

زمینوں کے بھگڑے پر ایک مقدمہ کافی عرصہ سے

عدالت میں زیر سماعت تھا۔ رفیق احمد کو امید تھی کہ وہ

تین بیٹیوں کے بعد عدالت ان ہی کے حق میں فیصلہ دے گی۔ اور آج مقدمے کا فیصلہ ہونا تھا۔ نعمان

احمد اور رفیق احمد دونوں اکٹھے شہر گئے تھے۔

توقع کے مطابق فیصلہ ان ہی کے حق میں ہوا تھا۔

جب وہ عدالت سے باہر نکلے تو رفیق احمد کے چچا زاد اور تایا زاد باہر عدالت کے احاطے میں ہی موجود تھے۔ انہوں نے کیسے توڑنگاہوں سے رفیق احمد کو دیکھا اور اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ رفیق احمد اور نعمان بھی گاؤں کی طرف سناڑم سفر ہوئے۔

راستے میں درختوں کے گھنے جھنڈ کے پاس رفیق احمد کے چچا زاد اپنے حواریوں کے ساتھ گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ رفیق احمد کو اپنا دفاع کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور بل بھر میں انہیں خون سے نہلا دیا گیا۔ اس کے ساتھ نعمان بھی مارے گئے۔

حوریہ پہ ایک اور قیامت ٹوٹی تھی۔ لوگ ہمدردی کی آڑ میں طنز کے تیر چلاتے۔ اماں فاطمہ کا کمزور اور بوڑھا وجود اسے کہاں تک سہارا دے سکتا تھا۔ وہ خود آسے دن بیمار رہنے لگی تھیں۔ انہی حالات کے پیش نظر زہرا بیگم اسے اپنے ساتھ لاہور لے آئیں۔

اب چھو پھوڑ ہر ایسی اس کے لیے سب کچھ تھیں۔ حیدر اور حنا دونوں اس کے لیے بھائیوں کی طرح تھے۔ چھو پھوڑ نے سب رویہ پیسہ اس کے نام اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں جمع کروا دیا۔ گاؤں والی حویلی سے حوریہ کا قلبی و جذباتی تعلق تھا۔ اس نے فروخت نہیں کی اور نہ اس کا کوئی ایسا ارادہ تھا۔ باقی زمینیں بھی جوں کی توں پڑی تھیں مگر زہرا کے دل میں ایک بار بھی لالچ نہیں آیا۔

شہر لانے کے بعد زہرا نے حوریہ کا ایڈمیشن کالج میں کروا دیا۔ گریجویشن کرنے کے بعد اس نے اپنی خواہش پر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا۔

اس تمام عرصے کے دوران عافیہ نے اس کو اپنا فریضہ تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔

زہرا بیگم اسے بہت چاہتی تھیں ہر کام اس کے نشور سے ہوتا ہی بات اسے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ دو تین اچھی فیملیز نے حوریہ کے لیے اپنی لکھی کاظمہار کیا تو عافیہ نے کسی طرح ان کے کانوں تک یہ بات پہنچادی کہ حوریہ کا پہلے نکل ہو چکا ہے اور

یہ اپنے شوہر کو کھا گئی تھی۔ چاند نے یہ باتیں سن کر غماہ ہے کس نے رشتہ کرنا تھا یوں یہ معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ کچھ اگلے سیدھے رشتے آئے جن کو زہرا بیگم نے صاف جواب دے دیا ان کے دل میں شروع سے خواہش تھی کہ حوریہ حنا کی بیوی بنے اسی وجہ سے انہوں نے کسی اور اس کی شادی کے لیے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور اسی بات کو عافیہ نے ان کی کمزوری سمجھ لیا تھا۔

زہرا بیگم اور حوریہ دونوں ہی یہ نہ جان پائیں کہ اندرون خانہ عافیہ کیا کرتی رہی ہے۔ اس کا حسد اسے چین نہیں دیتا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کی دھمکی آمیز کال آنے کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ حنا کو سب کچھ بتا کر پینڈل کرنے کو کہے گی۔ مگر ڈاکٹر روم میں حنا کا دوست بیٹھا تھا اور عین وقت پہ اس نے اپنی زندگی کا سب سے خطرناک اور بولڈ اسٹیپ لیا تھا۔ اسی اسٹیپ پہ اس کی زندگی کی ہسٹری بیا بادی کا انحصار تھا۔

اپنی بقا کے لیے اسے ایک مرد کا سناڑا کرنا تھا۔ عافیہ نے اسے جیسا لوں گے قیدم مضبوط ہو جاتے وہ اس سہارے سے جان چھڑا دیتی۔

شیراقلن نے اپنا قول پورا کر دیا۔ اب وہ ڈاکٹر آفتاب سے بہت دور چکوال شیراقلن کے آبائی گھر میں بیٹھی تھیں۔

ماضی کا سفر بہت تکلیف دہ تھا اس کی آنکھوں کے گوشے سرخ ہو رہے تھے مختصر ہے اس وقت میں وہ خیالوں میں بہت سا سفر طے کر آئی تھی۔

شکستہ روح سے غم کے سارے پیرہن اک ان کر کے اترتے جا رہے ہیں لمحہ لمحہ میں زمین سے دور ہوتی جا رہی ہوں

چھڑائے گی۔ مگر نیند بڑی ظالم تھی اس کا پروگرام اوچھوڑا رہ گیا تھا۔ شیراقلن جب اپنے بید روم میں داخل ہوا تو گاؤں کے نیک لگائے وہ نیم دراز سو رہی تھی۔ اس کی پانگوں پہ نرم مولا ئیم کبل پڑا تھا۔

یہاں بارشیں بہت ہوتی تھیں اور آج ہونے والی بارش نے موسم کو سرد کر دیا تھا۔ موسمی کیفیت کو دیکھتے ہوئے یا سمیں نے کبل بند کیا یا سختی رکھو دیا تھا۔

حوریہ بند پہ دراز ہوئی تو نیند آنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ ٹھنڈے لٹنے پہ اس نے غنودہ کیفیت میں ہی کبل پاؤں اور ٹانگوں پہ ڈالا تھا۔

گلاب کے پھولوں کی خوشبو پورے ماحول کو معطر کرتے ہوئے کچھ اجنبی اجنبی سی سرگوشیاں کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

شیراقلن نے کپڑوں کی ماساری سے اپنا ٹائٹ ہوٹ نکالا۔ وہ روایتی دولہا کی طرح تیار نہیں ہوا تھا۔

نیم گرم پانی سے شاور لینے کے بعد اس کی توساری ٹھکن ہو رہی تھی ساتھ نیند بھی۔ حوریہ ابھی تک محو خواب تھی۔ اتنی آنکھوں کے بعد بھی اس کی آنکھیں نہیں کھلتی تھیں۔

شیراقلن گلاس وینڈو کی طرف گیا اور پردہ ہٹایا۔ باہر ابھی تک بارش برس رہی تھی اس نے پردے دوبارہ برابر کر دیے۔

بید روم کی ساری فینسی لائٹیں روشن تھیں۔ اس نے ایک کے سوا سب آف کر دیں۔ کوئی خیال آنے پہ اس نے وہ بھی بند کر دی۔ اب صرف حوریہ کی سائیڈ پہ بیڈ لیٹ چل رہا تھا۔ گاؤں کے ساتھ ساتھ باقی دو تیلے بھی حوریہ کے قبضے میں تھے۔ گاؤں کے تیلے سے اس نے نیک لگائی ہوئی تھی اور وہ سراسر اس کی گردن اور سر کے نیچے تھا۔ تیسرا تکیہ اس کے پہلو کے پاس پڑا تھا جہاں وہ اپنا لٹا ہوا تھا اور بازو بھی رکھے ہوئے تھی۔

شیراقلن لائٹس آف کر کے بیڈ کی طرف آیا۔ وہ پاؤں سمیٹ کر کھڑکی سی بنی سو رہی تھی۔ وہ اس کی بائیں سائیڈ پر بیٹھ گیا۔ اب وہ مکمل طور پر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ دائیں بازو اس کے سینے پہ

رکھا ہوا تھا جو سینے کے زیر دہمست ہو لے ہو لے مل رہا تھا۔ کنبیوں سے اوپر تک مندی چھب دکھلا رہی تھی۔

”پلیز آپ کو اللہ کا واسطہ مجھ سے شادی کر لیں۔ میری مدد کریں ورنہ میں بالکل تباہ ہو جاؤں گی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ یہ میں آپ سے ایک انسان ہونے کے ثبات کہہ رہی ہوں۔ انسانیت کے واسطے میری مدد کریں۔“

شیراقلن ایک ٹک اسے دیکھ جا رہا تھا۔ اس کے یا قوتی لب اسے بولتے محسوس ہو رہے تھے حالانکہ وہ خاموش تھی مگر اس کی آواز شیراقلن کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یوں سوتی ہوئی وہ اس کے خوابیدہ جذبات کو جگا رہی تھی شیراقلن کا ہاتھ اس کے بازو کی طرف برہا اور چہرہ حوریہ کی طرف جھکا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی گستاخی کرنے میں کامیاب ہوتا اس کے ہاتھ کے لمس سے حوریہ بیدار ہو گئی۔ وہ سنسنیل ہو گیا۔

حوریہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے اپنا آپ تیزی سے ہٹوا دیا تھا۔

گازندگی میں پہلی بار وہ یوں پور پور جی تھی۔ رنگ اس کے سارے وجود میں دمک رہے تھے اور وہ اتنی دلکش اور براہ سرار محسوس ہو رہی تھی کہ شیراقلن کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے سارے بھیدوں سے یکدم واقف ہو جائے۔

حوریہ نے خود بھی تصور نہیں کیا تھا کہ دلہن بن کر وہ اتنی حسین لگے گی۔ ابھی کچھ دن پہلے جن مہمانوں نے ناشا کو دلہن کے روپ میں دیکھا تھا انہوں نے آج یہی کہا تھا کہ حوریہ اس کے مقابلے میں بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔ خود اس نے بے دلی سے صرف ایک بار آئینہ دیکھا تھا۔ اسے اپنا رنگ روپ سب بیکار لگ رہا تھا۔

شیراقلن کنوارا نوجوان تھا جب کہ وہ خود داغ لگا چاند تھی۔ یہ چاند شیراقلن کے آئین میں اترنے کے کہاں لائق تھا۔ عافیہ بھابھی نے اس کے پرد پونزل پہ پورے تین سے کما تھا کہ یہ رشتہ چل نہیں پائے گا

لڑکے دلی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسی شادیاں کر لیتے ہیں مگر جذبات کا طوفان اترتے ہی یہ رشتہ کاغذ کی ناؤ بن جاتا ہے جس کے مقدر میں ڈوبنا ہی ہوتا ہے۔
نقطہ۔

غافیہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ شیراقلن حناں کے دوست کی حیثیت سے یہاں آتا جاتا رہا ہے تو حوریہ اسے پسند آگئی ہے اس حد تک کہ اس نے اپنے بڑوں کو رشتے کے لیے بھیجا دیا۔
”لگتا ہے بہت تھک گئی ہیں آپ؟“ شیراقلن کی گہری نگاہیں اس کے پورے وجود کا طواف کر رہی تھیں۔

”جی ہاں کافی لمبا سفر تھا پھر اتنا بھاری لہنگا اور جیوری میں نے پہلے کبھی چسپی نہیں تھی۔“ وہ بہت سلیقے سے خود کو سمیٹ کر پیچھے ہوئی تھیں۔

”بہت خوبصورت لگ رہی ہیں آپ اور فلورل ڈیکوریشن کیسی لگی آپ کو؟“

”جی بہت اچھے لگ رہے ہیں پھول۔“ اسے کچھ نہ کچھ بولنا ہی تھا۔

”لیکن آپ سے زیادہ اچھے نہیں۔ مجھے ریڈ روز بہت پسند ہیں میں چاہ رہا تھا آپ جب یہاں آئیں تو یہ پھول ہی آپ کو خوش آمدید کہیں۔“

وہ سائیڈ ٹیبل کی دروازہ کھول کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

حوریہ کی صندلی پیشانی پر یکدم پسینہ آگیا۔ وہ پلٹا۔

اس کے ہاتھ میں زنجیر کے ساتھ بہت خوبصورت لاکٹ تھا۔ جو یقیناً ”حوریہ کے لیے تھا۔“

”بہت جلدی میں لیا ہے۔“ وہ اس کا لاک کھیل چکا تھا۔ حوریہ اضطرابی انداز میں بند سے اتری ”نضا“

میں جوڑیوں کا جالترنگ ابھرا۔ شیراقلن اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اضطرابی کیفیت حوریہ کے

چہرے سے مترشح تھی۔ ”کیا ہوا ہے؟ آپ کھڑی کیوں ہوئی ہیں؟“

”میں یہ کپڑے تبدیل کرنا چاہ رہی ہوں۔“

”اوہ۔۔۔ آپ۔۔۔ جا میں کہیں ڈوہ ٹھنڈی سانس بھرتا پیچھے ہٹ گیا۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ

حوریہ ابھی اسی روپ میں اور کچھ دیر اس کے سامنے رہے۔ وہ کپڑے نکال کر چلی گئی۔ شیراقلن اس کے انتظار میں بند پہ نیمہواراز ہو گیا۔

گہری کی ٹنگ ٹنگ وقت گزرنے کا احساس دلا رہی تھی۔ خاصی دیر بعد وہ واپس آئی۔

سادے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس سر اور کندھوں کے گرد دھڑلے لپیٹے اس نے گویا اپنے سارے اسرار محفوظ کر لیے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حوریہ جا کر

صوفے پر بیٹھ گئی۔

”آپ وہاں کیوں بیٹھ گئی ہیں؟“ وہ حیرت سے ٹھٹکا۔

”میں اس مقام کے قابل نہیں ہوں جو آپ مجھے دینا چاہ رہے ہیں۔ میں نے مجبوری کے عالم میں اپنی

نسوانی اتار کو مار کر آپ سے مدد مانگی۔ غلام حالات میں

میں ایسا کچھ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے یقین سا تھا کہ آپ ضرور میری مدد کریں گے اور میرا

یقین سچا ثابت ہوا۔ آپ نے مجھ سے ابھی تک نہیں پوچھا کہ وہ دن سے ایسے حالات آتے ہیں جن کی بنا پر میں

یہ مطلب کرنے پر مجبور ہوئی۔“

”آپ خود ہی بتادیں۔“ وہ حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حوریہ اسے سنبھل سنبھل کر سب حالات بتانے لگی۔ اس دوران وہ اپنے آنسو پینے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔

”تو آپ اب کیا چاہتی ہیں۔۔۔“ شیراقلن بند سے اتر کر اس کے سامنے آگیا تھا۔

”مجھے آپ کی ضرورت سے کیونکہ ڈاکٹر آفتاب نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ کچھ لکھی کر سکتا ہے۔“

”مطلب جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو ہمارے اور آپ کے راستے الگ ہو جائیں گے؟“ وہ

دلی جذبات کو چہرے سے غماں نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

”جی ہاں۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔ شیراقلن کے

لبوں پہ بخمسکراہٹ آگئی۔

”جب آپ کو غم تھا کہ آپ کو کچھ عرصے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہے تو اس کے لیے شادی جیسے ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟“ کوشش کے باوجود وہ خود کو یہ کہنے سے روک نہیں پایا تھا۔

”میں کسی اور ذریعے سے بھی آپ کی مدد کر سکتا تھا۔“

”مگر میں ایک کمزور لڑکی تھی۔ آپ کسی اور ذریعے سے میری مدد کرتے تو مجھے پہ انگلیاں اٹھتیں جو مجھے گوارا نہیں کسی صورت۔“

”کیا کہوں میں حوریہ صاحب! آپ کو سب نے مجھے مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔“

شیراقلن کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ حنان کی جو کزن خود کو مظلوم ترین لڑکی کے روپ میں پیش کر رہی ہے اور حقیقت اس کی بھی مظلوم نہیں ہے۔ غصہ اسے بہت شدید آ رہا تھا۔

”میں نے آپ سے بہر حال شادی کی ہے نکاح نامہ میرے پاس ہے شوہرانہ حقوق میرے پاس محفوظ ہیں جنہیں آپ بھی چیلنج نہیں کر سکتیں۔“

اسے یوں لگا جیسے حوریہ ابھی رو دے گی۔

”میرے پاس ہے ہی کیا میری پہچان ہی کیا ہے ایک نوجوان تو وہ ایک دلغ لگا چاند۔ آپ کی عملی سے یہ بات چھپائی گئی ہے۔ کل جب یہ بات کھلے گی تو تو سب وہ میرے بارے میں اچھا نہیں سوچیں گے اس لیے آپ کے ساتھ میں کوئی ایسا تعلق بنانا چاہتی ہی نہیں۔ میرا آپ کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ یا فیہ بھائی مجھے اپنے بھائی کے ساتھ تھی کرنا چاہ رہی تھیں۔ مجھے پتا تھا اگر ایک بار میں وہاں بچیں جاتی تو میرا نکلتا ناممکن تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ حنان یا حیدر بھائی کو میری وجہ سے نقصان پہنچے میں نے آپ کو اس وقت ڈرامنگ روم میں دیکھ کر اچانک فیصلہ کیا تھا کہ آپ اس گرواب سے نکالنے میں میرا ساتھ دے سکتے ہیں۔ میں مانتی ہوں میں نے خود غرضی سے کام لیا ہے مگر جانے سے پہلے میں معافی مانگ لوں گی۔“ اس کے آخری الفاظ پہ شیراقلن چونک گیا۔ اس کا غصہ حوریہ

کے آنسوؤں سے دم توڑ چکا تھا۔

”جب حالات آپ کے حق میں ہو جائیں گے تو آپ کیا کریں گی؟“ وہ اس کے آنسوؤں سے الجھن محسوس کر رہا تھا۔

”میں آپ کا گھر چھوڑ دوں گی۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس چلی جاؤں مگر واپس پلٹ کر پھوپھو کے گھر نہیں جاؤں گی۔“

شیراقلن بہت گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر گلاس ونڈو سے پردے کھسکا کر کھڑکیاں حوال دیں۔ بارش ایک تواتر سے برس رہی تھی۔

”حوریہ! آپ سو جائیں۔“

اس نے ساری لائیں آف کر دی تھیں خودہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ حوریہ نے صوفے پہ بیٹھے بیٹھے ہی کشن سر کے نیچے رکھا اور دروازہ ہو گئی۔ کھلی کھڑکی کے راستے بارش کی بوندیں اندر تک آئیں۔ حوریہ کی کب آنکھ لگی اور کب وہ دروازہ کھول کر بیروں پر گیا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

دونوں ہاتھ دستک پہ نکالنے باہر اندھیروں میں کچھ کھوٹا شیراقلن بارش کی ٹپ ٹپ کی آواز پر ہلکے چکا تھا۔

مرے نصیب میں پھر یہ بہار ہو کہ نہ ہو نہ جانے پھر وہ مرا غمگسار ہو کہ نہ ہو یہی بہت ہے ایک شخص چین پا جائے بھلے درخت بہت سایہ دار ہو کہ نہ ہو مگر یہ بٹے ہے کہ میں اس کے غم میں رہتا ہوں مرے لیے وہ بھلے بے قرار ہو کہ نہ ہو میں دھوپ بن نہیں سکتا کسی کے لیے مرنے لیے کوئی ابر بہار ہو کہ نہ ہو

صبح شیراقلن کی آنکھیں شب بیداری کی چٹنی کھارہی تھیں شاید وہ رات بھر نہیں سویا تھا۔ ساڑھے دس بجے دروازہ پہ دستک ہوئی تو حوریہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے فوراً ”اٹھ کر کشن جگہ پر رکھا اور دپٹ سنبھال کر دروازہ کھولا۔ باہر شیراقلن کی کزن شینہ

”صبح بخیر۔ آپ فریش ہو جائیں میں ناشتہ ادھری لاتی ہوں کیونکہ بانی سب کر چکے ہیں۔“ وہ پلٹ کر چلی گئی۔ حوریہ کو جانے کیوں شرمندگی سی ہوئی۔

شیراقلن سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ حوریہ واش روم سے منہ ہاتھ دھو کر آئی تو وہ بیٹھے کے سہارے نیم دروازہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بست سرخ ہو رہی تھیں۔

شینہ ناشتہ لے کر آئی تو تب وہ اٹھ کر ہاتھ روم میں گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ نما کر نکلا۔

صوفے پہ بیٹھ کر اس نے نیل اپنی طرف تھیمی۔ حوریہ بنو کر سی بیٹھی ہوئی تھی۔

”آئیں“ آپ بھی ناشتہ کر لیں۔“ یہ پہلی بات تھی جو شیراقلن نے اس سے کی تھی۔ وہ جھجکے ہوئے اس سے قدرے دور ہو کر بیٹھ گئی۔

شیراقلن نے چائے کپ میں ڈال کر باقی ٹرے اس کی طرف سرکادی۔ اس نے بھی صرف چائے ہی پی۔

”امید ہے کہ میری عزت کا آپ خیال رکھیں گی۔“ وہ کچھ بھی ہو بہر حال آپ میری بیوی ہی نہیں ہیں۔ آپ کے خیالات اور ارادوں کا میری فیملی کو پتا نہیں ہے اور انہیں پتا چلنا بھی نہیں چاہیے۔ بانی رہ گیا ڈاکٹر آفتاب کا مسئلہ تو اسے میں ہینڈل کر لوں گا۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری فیملی نے بڑے اور مانوں سے میری شادی کی ہے۔ کبھی خود سے ہٹ کر بھی سوچنا چاہیے۔“

آخر میں اس کا لہجہ سرد سا ہو گیا۔ چائے کا کپ اس نے واپس لے کر رکھ کر پھر ایک سگریٹ سلگایا۔

ناشتے کے برتن واپس لینے کے لیے آنے والی لڑکیوں میں بہت سے نئے چہرے تھے جو حوریہ کے لیے یکساں تھے۔ سب انہی مذاق کر رہی تھیں۔ حوریہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے شوخ خوالوں کا کیا جواب دے۔

”آپ یہ سوٹ پہن کر آئیں میں پھر آپ کا میک اپ کرتی ہوں“ آپ کو نیچے لے کر جانا ہے کیونکہ

پھوپھو کا حکم ہے۔ عورتیں آرہی ہیں گاؤں کی۔ سب کو دلہن دیکھنے کا زبردست شوق ہو رہا ہے۔“

یہ اسیہ تھی شیراقلن کی ماسوں زاوہ شوخ اور ہنسور۔ اس نے خود ہی حوریہ کے لیے بہت اسٹائلش سا سوٹ نکالا۔ ساتھ ہی جیننگ جیولری اور سینڈل بھی تھے۔ شیراقلن چیخ کر کے نیچے جا چکا تھا۔

حوریہ کو بھی لڑکیاں مسمان خواتین کی طرف لے آئیں۔ اکثریت کی نگاہوں میں اس کے لیے پسندیدگی تھی۔

سارا دل عورتیں ہی دلہن کو دیکھنے آتی رہیں۔ پھر کے بعد سب کھانا کھانے بیٹھے تو شیراقلن کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ ایمان اسے دوستوں کے درمیان سے بلا کر لایا تو اس نے بھوک نہ ہونے کا غر کیا۔

حوریہ دیکھ چکی تھی اس نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا صرف چائے کا ایک کپ لیا تھا اور اب بھی اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ یا سمین کھانے سے فارغ ہو میں تو ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

”دلہن! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے میں اس کی سرخ سرخ آنکھیں جو شب بیداری کی چٹنی کھارہی تھیں یا سمین کو پریشان کر گئیں۔“

”جی ماما! میں ٹھیک ہوں بس سر میں درد ہے۔“

اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

یا سمین نے جھک کر اس کا ماتھا چوما اور سردبانے لگیں۔

”اب تمہاری بیوی آگئی ہے اسی سے خد متیں کراؤ اپنی۔“ ٹی وی لاؤنج میں سب بیٹھے تھے۔ حوریہ ان کی بات پہ زور سی ہو گئی کیونکہ سب کی توجہ ایک دم اس کی طرف ہو گئی تھی۔

”جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ تھوڑا سونو“ فریش ہو جاؤ گے۔ اور حوریہ بیٹا! تم بھی جاؤ اور پرتھک گئی ہوگی بیٹھ بیٹھ کر۔“

انہوں نے باری باری دونوں کو حکم دیا۔ حوریہ کو تو دونوں ماسوں کی ہود میں لے آئیں تھام کر۔

انہوں نے زبردستی اسے اٹھایا۔

حوریہ کو اس نے توجہ سے نہیں دیکھا تھا مگر کمرے میں آنے کے بعد نظر رو کر اسی کی طرف اٹھ رہی تھی۔ کاپر اور سی گرین لکڑی کے سوٹ میں ملبوس وہ کل سے بھی زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔ پھر وہ جو سویا تو چہرے کے بعد ہی اٹھا۔

آنکھ کھٹنے پہ سامنے حوریہ کی نظر آئی جو صوفے پہ بے زار کن انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟“ شیرا فگن نے خوب ہی مخاطب کیا۔

”کچھ نہیں“ اس کے پوچھنے پہ وہ اور بھی پریشان نظر آنے لگی۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتا۔ سائیڈ ٹیبل پہ برا اس کا سیل گنگناٹے لگا۔ حوریہ کی بیسٹ فرینڈ ملائیکہ کی کال تھی۔ اس نے کئی بار ات والے دن شیرا فگن سے اس کا سیل نمبر لیا تھا۔ حوریہ کا تو نمبری آف تھا۔

”السلام علیکم“ شیرا فگن نے سیل آن کر کے کہا۔ ملائیکہ اس کی خیر خیریت پوچھ رہی تھی۔ شیرا فگن نے کچھ دیر بعد اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہنوز لیٹا ہوا تھا۔

”یہ لیں“ آپ بات کریں حوریہ سے۔ اس نے سیل فون حوریہ کے ہاتھ میں دیا۔

وہ اس وقت جتنی خوش ہوئی ملائیکہ کی آواز سن کر پہلے کب ہی نہیں ہوئی تھی۔

”اور سناؤ کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں سولی ہوئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اٹھی ہوں۔“

”آف یہ کون سا ٹائم ہے سونے کا؟“ ملائیکہ نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”رات کو بھی کافی لیٹ سولی تھی۔ ابھی سہ پہر میں آئی نے کہا کہ جا کر آرام کرو۔“

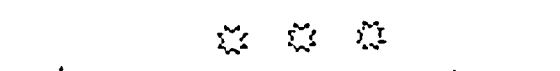
”ایک دن میں ہی جنابہ کی نیندیں ڈسٹرب ہو گئی

ہیں۔“ ملائیکہ کی کھانکھانی آواز سیل فون سے باہر تک آرہی تھی۔ یقیناً ”شیرا فگن بھی سن رہا تھا۔“ اور تمہارے ہونٹ کسے ہیں۔ کیا ملائیکہ دکھائی میں ہے؟“ وہ چپ سی ہوئی تھی۔ تب ہی پاس لینے شیرا فگن نے اس کے ہاتھ سے اچانک سیل فون لے لیا۔

”میں نے رونمائی میں ان کو اپنا آپ دست دیا ہے۔ پتا نہیں آپ کی دوست کو یہ گفت اچھا لگا کہ نہیں۔“

دوسری طرف سنتی ملائیکہ پھر ہنس پڑی۔

شیرا فگن اپنے مخصوص اسٹائل میں اس سے بات کرتا رہا جس میں اعتماد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔



ولیمہ اگلے روز تھا جو بہت دھوم دھام سے ہوا۔ لاہور سے عافیہ، نٹاشا اور حنا اور حیدر بھائی، نیار بے تک پہنچ گئے تھے۔ عبد اللہ ملک نے پوری برادری دوستوں اور جاننے والوں کو مدعو کیا تھا۔

حوریہ اپنوں کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ عافیہ کبھی جتنی نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ نٹاشا حوریہ کے کندھے سے لگی اس کے کانوں میں اپنے مخصوص لالچاں انداز میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔

”شیرا فگن بھائی سے کچھ اندراشیں لگ ہوئی ہیں۔“

نہیں ابھی تک؟ میں اور حنا تو ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے مگر آپ اور شیرا فگن بھائی میں تو ایسا سلسلہ ہی نہیں تھا۔ اس کے سوالوں نے حوریہ کو زچ کر دیا تھا۔

اس کا بیڈ روم دیکھ کر اس نے ستائشی انداز میں سر ہلاتا تھا۔

”پورا ایکڑ گلابوں سے بھر دیا، لگتا ہے آپ کے ہونٹ بہت رومینٹک ہیں۔“ نٹاشا کی سرگوشی اتنی اونچی تھی کہ شیرا فگن کی گزرتے ہی سن لی۔

”یہ تو حوریہ کو بتا ہو گا کہ کتنے رومینٹک ہیں۔“ کیونکہ اتنی جلدی شادی کروائی ہے شیرا فگن نے۔ یہ عاصمہ تھی۔ شیرا فگن کی بچا زاد جس کی کچھ عرصہ پہلے شادی ہوئی تھی۔

حوریہ ان سب کے درمیان اکیلی تھی۔ شیرا فگن قدرے سائیڈ پہ تھا۔ عاصمہ اسے بھی لے آئی۔

”حوریہ اتنی چپ چپ ہیں۔ کیا کر دیا ہے آپ نے؟“ نٹاشا اسے دیکھتے ہی شروع ہوئی۔

”پوچھ لیں ان سے میں نے تو کوئی گستاخی نہیں کی ہے ابھی تک۔“ شیرا فگن نے جوابات کی بھی وہ اتنی مشکل بھی نہیں تھی جو حوریہ کی سمجھ میں نہ آئی وہ پانی پانی ہو گئی شرم سے۔

”آپ اتنے صبر والے لگتے تو نہیں ہیں ا فگن بھائی۔“ یہ نادیدہ تھی اس کی خالہ زاد بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔

”اور کیا آپ نے تو شور مچایا ہوا تھا کہ پندرہ دن میں شادی کرو میری۔“

”میری دلہن کو تنگ نہ کرو سب۔“ اس نے بڑے پیار سے حوریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا جیسے ابھی رد دے گی۔

”اؤ ہو وہ دن ملن ہی اتنا خیال اور پیار۔“ عاصمہ نے شیرا فگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں زندگی بھر کا جو ساتھ ہے۔“ اس نے حوریہ کے حنائی ہاتھوں پہ اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے دہرایا تو سب کے سامنے اس کی اس حرکت پہ حوریہ بری طرح نروس ہو گئی۔

”حوریہ کو نیند آرہی ہے، دو دن سے انہیں ریسٹ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے تو آپ سبھی الحاح انہیں اکیلا چھوڑ دیں اور کراخانی کریں۔“

شیرا فگن نے سائیڈ ٹیبل سے اپنی رسٹ وارج اور موبائل بھی اٹھایا۔ وہ منتظر تھا ان سب کے جانے کا۔

”ہو ہو ہو ہو“ عاصمہ نے شور مچا دیا۔ ”کتنی اچھی قسمت ہے آپ کی، ستا پیار کرنے لگے ہیں ا فگن بھائی آپ سے۔ خوش نصیب ہیں آپ۔“

نٹاشا نے کتنے رشک سے اسے دیکھا تھا۔

”ورنہ آج کل کنواری لڑکیوں کو بھی اتنے اچھے لڑکے نہیں ملتے۔“ عافیہ نے اس تمام عرصے میں

پہلی بار زبان کھولی تھی۔

اس کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ صرف حوریہ تک ہی پہنچ پائی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا۔ عافیہ کو عجیب کھینچی سی خوشی ہوئی۔

شیرا فگن کی آنکھوں سے جذبات کے لپکتے شرارے اور محبت کا دالمانہ اظہار اسے ایک آنکھ نہیں بھارا تھا۔

”ابھی آج تیسرا دن ہے۔ یہ چڑھتا دیرا اترتے دیر نہیں لگے گی پھر تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی۔ اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ شیرا فگن تمہیں اسی طرح پیار کرتا رہے گا۔ اسے اور اس کی فیملی کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ نو عمری میں تمہارا نکاح ہو چکا ہے اور یہ کہ تم بیوہ ہو۔“ شیرا فگن نے تو تمہیں کنواری جان کر شادی کر لی مگر کل جب یہ بات کھلے گی تو کیا ہو گا؟ اس کی فیملی اور پورا خاندان تو تم نے دیکھ لیا ہے۔ شیرا فگن کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ میں نے تو تمہارے بھائی سے کہا تھا کہ یہ صرف دو انسانوں کا نہیں دو خاندانوں کا

بہوالتہ ہے آپ اتنی بڑی بات نہ چھپا میں مگر حیدر فگن مانے سو میں بھی چپ ہو گئی۔ اب خود ہی عقل سے کام لینا۔ ان آج کل کے لڑکوں کا پتا نہیں ہوتا، کبھی اس ڈال کبھی اس ڈال۔ میں تمہاری دشمن تو نہیں ہوں۔ پہلے ہی تم اتنے دکھ اٹھا چکی ہو۔ اسی وجہ سے میں نے راشد کے لیے تمہارا رشتہ مانگا تھا کہ سب کچھ معلوم ہے اسے اور وہ اس حقیقت سمیت تمہیں راضی خوشی قبول کر رہا تھا۔ اب سوچو ذرا کھل جب یہ بات شیرا فگن اور اس کی فیملی کو پتا چلے گی تو کیا ہو گا؟ سوچنا اس بات پہ۔ پھر کھولے کھرے کی پہچان ہوگی تمہیں۔“

عافیہ اس کے بالکل قریب جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ باقی لڑکیاں جا چکی تھیں۔

نٹاشا شیرا فگن کے ساتھ سارا گھر دیکھ رہی تھی۔ حوریہ نے جتنی مشکل سے اپنا آپ سنبھالا تھا۔ عافیہ اپنے تئیں ہمدردی جتا کر اب سب سرسرا ل والوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

دل تار پانگل ہے

دو کڑیاں لے کے چپ کر جاؤ

”نہیں نہیں کڑیاں نہیں پڑیاں۔ کیونکہ دل کی بیماری میں کڑیوں (کڑیوں) کی شینیں جگہ پڑیوں (دوائی) کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوائی کی پڑیوں کی۔“ عادل نے درستی کے نام پر ایمان کی کلاس لے والی تو پاس بیٹھی حوریہ ہنس پڑی۔

”شکر ہے رخ مبارک پہ نہی تو آئی۔ میں تو سمجھ رہا تھا ابھی روئے دھونے کا لباسا سیشن ہو گا اور مجھے ایک رد مال لانا ہو گا۔“

”مجھے پتا ہی نہیں چلا تاہم اتنا جلدی گزر گیا۔“ حوریہ نے بڑی محبت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

وہ ان کے جانے کا سن کر اداس تھی۔ وہ دونوں کتنی دیر سے اسے ہنسائے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایمان اگلے سیدھے گانے گا رہا تھا۔ لطیفے سنار رہا تھا۔ بالآخر حوریہ ہنس ہی پڑی۔

شیراقلن، یاسمین اور عبداللہ ملک بھی اوتھری بیٹھے تھے۔ عادل نے کہا تھا ”آج رات جاگ کر گزاریں گے اور ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔“

شیراقلن گاہے بگاہے نظر اٹھا کر اس کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ عادل اور ایمان کی پہنی میں حوریہ کتنی خوش لگ رہی تھی۔ بات بے بات نہی لیوں سے پھولی بڑ رہی تھی۔ جبکہ کمرے میں جب وہ اس کے ساتھ اٹھتی ہوتی تو یوں بن جاتی جیسے صدیوں سے چپ رہنے کی قسم کھاتی ہو۔

وہ رات باتیں کرتے ہوئے ہی گزری تھی۔ صبح سویرے انہوں نے چکوال سے لاہور کے لیے نکلنا تھا۔ حوریہ بار بار آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ یاسمین نے شیراقلن سے کہا تھا پہلی فرصت میں تم نے حوریہ کو لے کر ہمارے پاس آنا ہے۔

ایک رخ سی نہی نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا

تھا۔ تبھی تبھی شیراقلن کو شدید غصہ آتا۔ حوریہ نے اسے قریانی کا بڑا بتایا تھا۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ اسے پہلے حوریہ سے کوئی محبت نہیں تھی وہ تو اسے حنان کی گزن ہونے کے ثبات سے جانتا تھا۔ اس نے روتے سکتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی اسے خدا کا واسطہ دے کر شادی کے لیے کہا۔

اس کی آنسوؤں اور واسطوں نے اسے یہ جھوٹ بولنے پر مجبور کیا کہ مجھے حوریہ سے شدید محبت ہے اور مجھے اس سے شادی کرنی ہے۔ بہت جلدی دور نہ اس کے گھروالے اس کی شادی نہیں اور کریں گے۔

حنان نے حوریہ کی گزشتہ زندگی کے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تو شیراقلن نے اس سے کہا کہ فی الحقیقت میری فیملی تک یہ بات نہ پہنچے۔ میں بعد میں موقع دیکھ کر خود ہی بتا دوں گا۔ عین وقت پر وہ بد مزگی نہیں چاہتا تھا اسی وجہ سے اس نے حوریہ کے نکاح اور بیوی والی بات چھپائی۔

اسے چاہیے تھا کہ سب جان کر دیکھ ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ بات قطعیاً ”اہمیت“ نہیں رکھتی تھی کہ حوریہ پہلے کسی کی مشکوٰۃ رہ چکی ہے۔ بلکہ اسے حوریہ سے ہمدردی ہوئی کہ حوریہ نے اس کی بھڑکی کے بعد کتنا مشکل وقت گزارا ہو گا ورنہ اس کے گھروالے چون سال کے عمر رسیدہ شخص کے ساتھ کبھی اس کی شادی پر راضی نہ ہوتے۔

نکاح کے بعد اس کے دل میں موجود بے نام سے جذبے کو نام بھی مل گیا تو دل خود بہ خود ہی اس کی طرف مائل ہونے لگا۔

شادی کی اولین رات اسے ولہنا بے کے بھرپور روپ میں محو خواب دیکھ کر شیراقلن کے ان چھوٹے ریشمی خواب جاگ بڑے۔ اس کا خیال تھا وہ اس کے جذبات کی پذیرائی کرے گی اس کی ممنون ہوگی۔

وہ اس کی پور پور کو محبتوں میں بھگونے کا خواب لے کر اس کے قریب آیا تھا۔ مگر کیا ہوا۔

حوریہ کو ایک محبت کرنے والے شوہر اور تحفظ کی

ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ اسے ڈاکٹر آفتاب کے عفریت سے بچنے کے لیے عارضی سہارا اور کار تھا۔ جو شیراقلن کی صورت میں مل چکا تھا۔

وقت رخصت حوریہ بار بار آنسو صاف کر رہی تھی۔ یاسمین نے جاتے وقت اسے پھرینے سے چھٹایا تو بے اختیار سسکیاں اس کے لبوں کی قید سے آزاد ہو گئیں۔ کیسا سکون ملا تھا۔ کیسا متا بھرا احساس تھا ان کی آغوش میں۔ اس کا دل الگ ہونے کو چاہ رہی نہیں رہا تھا۔ کیسی اپنی اپنی سی خوشبو آ رہی تھی ان کے وجود سے۔ عبداللہ ملک سے بھی ملنے وقت اس کی یہی حالت ہوئی۔

عادل اور ایمان بھی بہت اداس تھے۔ ”آپ نے بھائی کے ساتھ لازمی آنا ہے یو کے۔ میں آپ کو پورے ملک کی سیر کراؤں گا۔“ ایمان نے اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیا۔

”شیراقلن! حوریہ کا بہت خیال رکھنا ہے۔“ یاسمین نے شکایت کا موعظہ نہیں کیے۔ ”یاسمین! جیسے وقت چھر یاد دہانی کرائی تو ایک رخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آگئی۔

ایر پورٹ سے مہاپہا کو چھوڑنے کے بعد شیراقلن اسے ساتھ لے کر چھوٹے چچا کی طرف آگیا۔ ساتھ ملک شجاعت بھی تھے۔

حوریہ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل یہاں رکنے کو نہیں کر رہا تھا۔ وہ فوراً ”سے بیشر یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ مگر کتنا مجبوری تھی۔

ایک رات گزار کر وہ دوبارہ چکوال کی طرف عازم سفر ہوئے۔

ملک شجاعت لاہور میں تھے انہوں نے کہا تھا کہ اب وہ باقی زندگی گاؤں میں ہی گزاریں گے۔

شیراقلن کی شادی کے لیے لی جانے والی چٹھیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اس نے دادا جن کو کالی کر کے کہا کہ

وہ انہیں لینے آرہا ہے وہ ایسی کے لیے تیار رہیں۔ صبح ہی تیار ہو کر گاڑی لے کر چلا گیا تھا۔ حوریہ کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ پریشان سی تھی جانے کہاں گیا ہے۔

ایک بار اس کے جی میں آئی کہ پوچھے آپ کہاں ہیں۔ فون اس کے پاس موجود تھا۔ وہ کال کر سکتی تھی۔ ایک دو بار اس نے فون کرنے کی سوچی مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔

گھر میں کام کرنے والی ملازم عورتوں سے اس نے پچھلا احاطہ صاف کر دیا جو درختوں سے گرنے والے پتوں سے اٹا ہوا تھا۔

گھر بہت بڑا تھا۔ وہ مرد ملازم تھے دو عورتیں تھیں۔ ایک چھوٹا لڑکا تھا اور ایک ڈرائیور تھا۔ عبداللہ ملک جانے سے پہلے یہ سب انتظام کر گئے تھے۔

حوریہ نے یاسمین اور عبداللہ ملک کے جانے کے بعد اور شیراقلن کے کمرے کے ساتھ ہی اپنے لیے بھی ایک کمرہ سیٹ کر کے ضروری چیزیں وہاں پہنچا دی تھیں۔ اب کوئی ڈر نہیں تھا کہ کسی کو پتہ چل جائے گا۔ ویسے بھی ایک دن اسے یہاں سے چلے ہی جانا تھا۔ پھر جو بھی کچھ بھی کہتا اسے پروا نہیں تھی۔

رات تک شیراقلن دادا جان کو لے کر گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ حوریہ سے بہت پیار اور محبت سے ملے۔

شیراقلن نے ان سے کہا تھا کہ حوریہ آپ کے ساتھ گاؤں والے گھر میں ہی رہنا چاہتی ہے۔ اسے فطرت سے قریب تر رہنا اچھا لگتا ہے۔

ملک شجاعت خود تنہائی سے اکٹھا کر چھوٹے بیٹے کے پاس لاہور رہ رہے تھے۔ انہوں نے عمر کا زیادہ حصہ گاؤں میں ہی گزارا تھا۔ تین سٹل پہلے جب انجانا کا ایک ہوا تو ہو بیٹے انہیں لاہور لے آئے اس کے بعد وہ وقتاً فوقتاً ”گاؤں آتے رہے مگر یہ وہم و گماں میں نہیں تھا کہ وہ دوبارہ گاؤں والے گھر میں رہائش اختیار کر سکیں گے۔ حوریہ نے ان کی خواہش پوری کر دی تھی۔

شیراقلن اگلے دن اتوار کو لاہور واپس آگیا۔

شیراقلن، عثمان علوی کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا جو اس کا بہت اچھا دوست تھا۔

اسپیشل پولیس سرورسز میں بہت حساس عہدے پہ کام کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر آفتاب کے معاملے میں اس سے بات کرنے آیا تھا۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے کہا کہ ”فکر مت کرو“ میں ساری معلومات حاصل کر کے تمہیں بتاؤں گا۔“

عثمان کی قابلیت پہ اسے بھروسہ تھا کہ وہ اس کی مطلوبہ معلومات اسے مہیا کر دے گا۔ اس کے بعد سوچتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

حوریہ نے ڈاکٹر آفتاب کے رشتے اپنے انکار اور پھر اس کی دھمکیوں کے بارے میں تو بتا دیا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر آفتاب نے اس سے پیسوں کی فیہاندگی ہے اور نہ یہ کہ عین شادی سے کچھ روز پہلے اس نے حیدر بھائی سے پیسے مانگے تھے۔ نہ اس نے یہ بتایا کہ میرے نام کچھ زمین اور جائیداد ہے۔

اپنے بیٹے اس نے یہ بات چھپا کر عشق مندی کی تھی۔ کیونکہ اب اسے کسی پہ اعتبار نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کی فیہاندگی نے باور کرا دیا تھا کہ پیسہ اس کا نہایت کی بہت بڑی حقیقت ہے اس کے بغیر وہ بالکل زبرد اور بے وقعت ہے۔

غانیہ بھابھی کا انداز اس نے کتنا جلدی بدلتا دیکھا تھا۔ وہ زور و شور سے اسے بھابھی بنانا چاہ رہی تھیں حالانکہ پہلے ان ہی کا کہنا تھا کہ تمہیں کوئی کنوارا لڑکا قبول نہیں کرے گا پھر وہ خود ہی اپنے کنوارے بھائی کے لیے اسے راضی کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے پیسے کا کرشمہ ہی کہا جاسکتا تھا۔

شیراقلن کے گھر سے جانے کے بعد اسے یہ پیر ہی تحفظ دے سکتا تھا تب ہی تو اس نے یہ بات شیراقلن سے بھی چھپائی تھی۔ آخر بانی زندگی بھی تو اسے گزرائی تھی۔

کتنا اچھا ہو تا وہ بھی عام سی لڑکی کی طرح باقی دن بھی

یہاں گزار سکتی گھر میں بھی گزشتہ زندگی کی تمنیں آڑے آ رہی تھیں۔ اگر ان باتوں کی اہمیت نہ ہوتی تو حیدر بھائی شیراقلن سے سب کیوں چھپاتے۔

وہ اپنی آنکھوں کو سختی سے اس کے خواب دیکھنے سے روک چکی تھی۔ مگر نہ دل تو چاہتا تھا۔ اس کے شانوں پہ سر رکھ کر تمام آنسو بہا دے۔ اپنی تمام پریشانیوں اس کے سپرد کر کے سکون سے سو جائے۔

مگر خوابوں پر کس کا زور چلا ہے۔ اپنی سوجھ بوجھ کی شوریدہ سری سے وہ خود بھی ڈر رہا تھا۔ وہ اونچا لبا کردیل مضبوط سانو جوان نظر انداز کیے جانے کے قائل تو نہیں تھا۔ وہ سامنے آتا تو حوریہ دیکھنے سے بھی اجتناب کرتی۔

وہ نہ ہوتا تو خواہشیں اسے پکارتیں۔ خوابوں کی وادی میں اس کا پیچھے چلتے چلتے وہ تھک کر بندھال ہو جاتی۔

اس نے حوریہ کے خیالات اور ارادے جان کر اس کے ساتھ زبردستی کوئی تعلق بنانے سے سختی سے خود کو روک رکھا تھا۔ کوئی قرشتہ کوئی مسیحا انسان یا پھر خدا

وہ ابھی تک اسے جان نہیں پائی تھی۔ کہیں تم اپنی قسمت کا لکھا تبدیل کر لیتے، تو شاید ہم بھی اپنا راستہ تبدیل کر لیتے جدائی بھی نہ ہوتی زندگی سہل بھی ہو جاتی جو ہم اک دوسرے کا مسئلہ تبدیل کر لیتے

بہارِ عشق

آج موسمِ خاصا سرد تھا۔ شہل سے آنے والی سرد ہواؤں نے پورے ماحول کو بخیر بستہ کر دیا تھا۔

ثمینہ نے دادا جان کے کمرے کا آتش دان بہت سی لکڑیاں جلا کر روشن کر دیا تھا۔ حوریہ ان کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ گرم گرم چائے خود بنا کر لائی تھی۔ دادا جان شیراقلن کو یاد کر رہے تھے حوریہ کا دل دھڑک اٹھا۔

پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے تھے اسے دابور گئے

ہوئے۔ اس دوران اس نے حوریہ سے کس طرح کا بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ ہاں دادا جان کو وہ روزانہ کال کرتا۔ گیسٹ پیس گاڑی کا بارن مسلسل بج رہا تھا۔

آٹے والا شیرا فگن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بارن اس کی گاڑی کا تھا۔ ٹھیک دو منٹ بعد وہ ان کے سامنے تھا۔

ملک شجاعت نے سبے چوڑے شیرا فگن کو سینے سے لگایا۔

بے تابی سے اس کا ماتھا چوما۔ حوریہ نے حسرت سے ان دونوں کو دیکھا۔

وہ دادا جان سے ملنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں“ حوریہ نے اس کی طرف سے نظر ہٹائی تھی۔

دادا جان اس سے شکوے کر رہے تھے۔

”مختے دن لگا دیئے اس بار۔“

”دادا جان! باب میں یہ سب چلتا ہی ہے۔“ وہ نہیں کرولا۔

”حوریہ بھی بہت پریشان رہتی۔“

”کیوں؟“ اس کی نگاہ اچانک دادا جان کے پہلو میں بیٹھی سر جھکائے حوریہ کی طرف اٹھی۔

”کیوں کے کچھ لگتے۔ شادی کے فوراً بعد اسے چھوڑ کر چلے گئے ہوں پریشان نہیں ہوگی تو خوش ہوگی کیا۔“ انہوں نے اسے تقریباً ”ڈانٹ دیا۔“

وہ شرمندہ ہونے لگی۔

”ان کی اپنی مرضی تھی گاؤں میں رہنے کی۔ میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔“ اس نے اپنی طرف سے ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی اور کافی کامیاب بھی رہا۔

دادا جان نے حوریہ کو اس کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کو کہا۔ وہ جا کر ٹھینے سے کہہ آئی۔ پھر ٹھینے ہی کھانا لگا کر شیرا فگن کو لایا۔

کھانے کے بعد اسے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ حوریہ خود بنا کر لائی کیونکہ ٹھینے کو پانا نہیں آتی تھی۔

جونہی اس نے پی کر کپ رکھا دادا جان نے اپنی طرف سے گڈ ٹائٹ گمہ دیا۔

”میں سونے لگا ہوں تم دونوں بھی جاؤ اور حوریہ! تم اوپر جاؤ۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کر جانا۔“

انہوں نے بیڈ پر دراز ہو کر کبل ٹانگوں پر ڈال لیا۔ یہ ان کی طرف سے اعلان تھا کہ اب تم لوگ بھی جاؤ۔ انہوں نے آج حوریہ کو بھی اور جانے کو کہا تھا۔ ان کی حد درجہ توجہ یہ وہ نروس ہو رہی تھی۔

شیرا فگن تو تھکا ہوا تھا۔ بیڈ روم میں آکر اس نے پہلے شاور لیا پھر چٹخ کیا۔ وہ بال خشک کرتا ہوا بیڈ روم سے باہر نکل رہا تھا جب اس نے نیلے رنگ کے آپرل کی ہلکی سی جھٹک دیکھی۔ حوریہ اس کے کمرے میں دوڑھ رکتے آئی تھی اور پھر ان ہی قدموں پلٹ گئی تھی۔ وہ ساتھ والے بیڈ روم میں تھی۔

نونج گئے تھے۔ وہ ابھی تک بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ دادا جان صبح کے جاگے اس کے انتظار میں تھے وہ اٹھے تو ہاتھ اٹھتے کر رہ گئی۔ حوریہ آٹھ بجے پہنچ گئی تھی۔ ٹھینے ہاتھ کا ہتھام کر رہی تھی۔

دادا جان سے رہا نہیں گیا آخر۔ حوریہ سے کہا کہ ”دیکھو شیرا فگن جاگ گیا ہے کہ نہیں مگر نہیں جاگا تو اسے جگا کر لے آؤ۔“

ان کا حکم وہ ٹال نہیں سکتی تھی۔ مرنے کیلئے کرتی کے مصداق اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ پہنچ گئی۔ اس نے دستک دینے کے لیے دروازے پہ ہاتھ مارا۔ دروازہ لاک نہیں تھا کھلتا چلا گیا۔

وہ نما کربالوں میں برش کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ دیکھ کر چونکا۔

حوریہ نے نگاہ چرائی۔ اس نے صرف پینٹ پٹی ہوئی تھی شرٹ بیڈ پر ڈنگ میں تھی۔

”دادا جان! آپ کو بلا رہے ہیں کہہ رہے ہیں اسٹے ناشتہ کریں گے۔“ وہ جلدی جلدی بول کر چلی۔

”بات سنیں“ اس نے جاتی حوریہ کو پکارا۔ وہ اپنی شرٹ اور پینٹ کی پکٹ سنول رہا تھا۔

”جی!“ وہ پاس نہیں آئی دور سے ہی دیکھتی رہی۔

والٹ سائیڈ میبل پہ پڑا تھا۔ یاد آئے یہ اس نے وہاں سے اٹھایا۔

”حوریہ! یہ آپ رکھ لیں ضرورت پڑ جاتی ہے۔“ خاموش کھڑی حوریہ کے ہاتھ میں اس نے تقریباً ”زبردستی“ کچھ نوٹ تھمائے۔ وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔

”اگر اور ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا کیونکہ جب تک آپ یہاں ہیں کئی طور پر میری ذمہ داری ہے۔“

اس نے حوریہ کے پاس سے گزر کر بیڈ سے اپنی شرٹ اٹھائی۔ اس دوران حوریہ سے اس کا کندھانہ چاہتے ہوئے بھی لچھ ہوا تھا۔ وہ عین سامنے کھڑی تھی۔ وہ دوبارہ ہاتھ روم میں چلا گیا۔

شیرا فگن کے مردانہ لمس کو پہلی بار اس نے شدت سے محسوس کیا۔

عثمان کے آفس میں وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ عثمان نے ہی بلوایا تھا کہ ڈاکٹر آفتاب اور اس کی فاؤنڈیشن کے پارے میں میرے پاس بڑی اہم معلومات ہیں۔ تم آؤ تو ڈسکس کریں۔ ”آفس سے فارغ ہونے کے بعد وہ اسی کی طرف چلا آیا۔“

عثمان اسی کے انتظار میں تھا۔ اس کے پاس بڑے چونکا دینے والے انکشافات تھے۔

”بھئی یہ ڈاکٹر آفتاب تو اعلا درجہ کافر آیا نکلا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والے پروجیکٹ میں سے ایک ”آفتاب سرجیکل اینڈ میڈیکل کینڈیکس“ ہے اور ایک بہت اہم ”نیو یارک چائنا اسپتال“ ہے جس بارے میں ڈاکٹر موصوف کا دعوا تھا کہ یہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا واحد اسپتال ہے۔ اور یہاں چائینز طریقہ علاج مریضوں پہ استعمال کیا جاتا ہے۔ لاہور میں یہ ہاسپٹل قائم ہوئے چھ سال ہو گئے۔

ہیں۔ اس سے پہلے لاہور میں ڈاکٹر آفتاب کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن یہاں قدم جمانے کے ساتھ ہی اس نے اپنے دیگر پروجیکٹ بھی اشارت کر دیے۔

یوں اس کی شہرت بڑھتی گئی۔ کمزور عقیدے والے تو اسے لند والا سمجھنے لگتے۔ کیونکہ اپنی باری آنے پہ جو مریض بھی اندر جاتا ڈاکٹر موصوف کو قرآن پڑھتا ہوا ہی دیکھتا۔ چرب زبانی اسی پہ ختم تھی۔

ہر قسم کے مریضوں کو وہ فوراً ”نیسٹ“ کے لیے بھیج دیتا۔ اور کم پیسوں کے علاج میں مریض نیسٹ کرا لیتے۔ غریب مریضوں سے ڈاکٹر صاحب کم پیسے بھی لے لیتے۔ جوائڈ مٹ ہوتا۔ اسے کھانا میڈیسن سب کچھ ہاسپٹل سے مل جاتا۔ مریضوں کی تیمارداری کے لیے خوبصورت نرسیں چوبیس گھنٹے دستیاب ہوتیں۔ کچھ تو مستقل ہاسپٹل میں ہی رہ رہی تھیں۔ ڈاکٹر آفتاب کے آفس کے پیچھے وی آئی پی روم کے نام سے ایک وارڈ ہے۔ نرسز اور ڈاکٹر آفتاب کی خود سیکرٹری بھی وہیں رہتے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب جس بات کے لیے مشہور تھا وہ یہ تھی کہ وہ دس دن میں ہر مرض ہر بیماری کے علاج کا دعوے دار تھا۔ ہر مریض جب ایڈمٹ ہوتا تو اس کے جسم کے سارے نیسٹ کیے جاتے پھر بتایا جاتا کہ تمہیں فلاں فلاں بیماری ہے۔ دس دن کے بعد جب ڈسچارج کیا جاتا تو اسے نو نیسٹ کرواتے جاتے۔ یہ نیسٹ ڈاکٹر شعیب کی زیر نگرانی کیے جاتے جو آری کا مہارتہ کیپٹن تھا۔

پھر ان نیسٹ سے پتہ چل جاتا کہ مریض کو اب وہ بیماری یا بیماریاں نہیں ہیں جس کا شکار ہو کر وہ یہاں آیا تھا۔ پھر ان سے ایک فائل میں ان کے خیالات لکھوائے جاتے۔ ظاہر ہے وہ اچھے ہی ہوتے۔

یوں مریض خوش خوش گھر جاتا کہ وہ مکمل صحت یاب ہو کر جا رہا ہے۔ اس کے بعد مریض چیک آپ کے لیے بھی آتا جس میں ہر چکر میں پانچ سے سات ہزار ایک ماہ کی روائی کے طور پہ وصول کیے جاتے۔ ایک مریض کے ریفرنس سے اور بھی مریض آجاتے۔

یوں اسپتال کا کام زور و شور سے چل رہا تھا۔
ہومیو پیتھک ڈاکٹر نے آپریشن ٹیبل پر بھی بنایا ہوا
تھا۔ جہاں ہر طرح کے آپریشن کیے جاتے اور بھاری
فیس وصول کی جاتی۔ یہ ڈاکٹر ہومیو پیتھک، ایلیو پیتھک،
آکوپچر کے ساتھ قرائن تحریر کے ذریعے بھی علاج کا
دعویدار ہے۔
ہاسپٹل کے ساتھ ڈاکٹر آفتاب نے ایک این جی او
بھی بنائی ہوئی ہے اور بے سہارا یتیم بچوں اور عورتوں
کے لیے ایک ادارہ بھی ہے جس کے بارے میں بڑے
بڑے دعوے کیے جاتے ہیں۔ خیر سب تو ہے ہی۔
ڈاکٹر آفتاب کا بیک گراؤ بہت انٹرنٹنگ ہے۔
لاہور میں جو اس کے بارے میں سامنے سے وہی
پتہ ہے سب کو لیکن لاہور سے پہلے وہ کہاں تھا کسی کو
نہیں پتہ۔ اس نے کہا تو یہی کہ وہ ملک سے باہر اپنے
فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ حالانکہ حقیقت اس کے
برعکس ہے۔

ڈاکٹر آفتاب لاہور آنے سے پہلے پنڈی لڈیالہ روڈ
گلشن آباد میں اپنا ہی دھندا چلا رہا تھا۔ وہاں اس سے
کچھ بے احتیاطی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا بول
کھلنے کے قریب تھا سو وہ وہاں سے اسپتال ختم کر کے
لاہور میں آگیا یہاں بھی اس کی یہی سرگرمیاں تھیں۔
ڈاکٹر آفتاب نے پوش علاقے میں گھر لیا جہاں
ماڈرن اونچے گھرانوں کے لڑکے لڑکیوں کی آمد و رفت
دن رات جاری رہتی۔ عشق کے مارے لڑکے یہ
اونچے گھرانوں کے بچے اپنا وقت رنگین گزارنے کے
عوض ٹھیک ٹھاک پیسہ ادا کرتے۔

اسپتال میں کام کرنے والی تقریباً "سب لڑکیاں
نمایت غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر
آفتاب نے چن چن کر خوبصورت لڑکیوں کو رکھا تھا۔
یہ لڑکیاں بظاہر مریضوں کی خدمت کے لیے تھیں مگر
درحقیقت یہ کون سی خدمات سرانجام دیتی سب کو ہی
معلوم ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر آفتاب نے شادی کے نام پر بے شمار مجبور
عورتوں کا پیسہ کھایا۔ ان کی جائیداد ہضم کر ڈالی۔

آفتاب نے اپنے اغوا کا ڈرامہ رچا کر تاون میں خاصی
جنگری رقم وصول کی۔
ایسی بے شمار عورتوں سے اس نے شادی کی۔
انسانیت کے سہارے کے نام پر انسانوں کے سیخا کے
نام سے اس نے چہروں والے ڈاکٹر نے عورتوں کے ساتھ
کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ شادی اس کے لیے
دوسرے الفاظ میں آمدنی کا ذریعہ تھی۔
ڈاکٹر آفتاب کا اپنا بیٹا اور بھائی سمیت اس کی دونوں
بیٹیاں بھی اس مذموم کام میں اس کے ساتھ رہیں۔
ڈاکٹر آفتاب کا بیٹا جلی ڈاکٹر ہے اور خیر سے وہ نجی
باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ ایک بیٹی بھی جلی
ڈاکٹر ہے۔ لیکن لاہور آنے کے بعد اس نے اسپتال
جو اس نے نہیں کیا۔ شیراقلین پوری دلچسپی سے من رہا
تھا۔

"بھئی تازہ صورتحال سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔
ڈاکٹر آفتاب نے ضرورت ہے کا اشتہار دیا تھا اسے
اسپتال کے لیے نرس کی ضرورت تھی۔ خیر نرس اس
نے منتخب کرلی۔

کچھ ہی گھنٹوں میں اس نرس کو یہاں جا رہی جلی
سرگرمیوں کا نظم ہو گیا یہ نرس کو ایسا لگا کہ اس نے
کچھ بے ایمانیاں بکریں۔ یہاں ٹیسٹ کے بعد غلط
جلی رپورٹس بنائی جاتیں۔ اسے شک ہوا۔ اس نے
اپنی ایک مریض رشتہ دار کو ڈاکٹر آفتاب کے پاس
جائے کو کما نرس بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح آگاہ
تھی۔ وہاں جانے کے بعد ان خاتون کے کچھ ٹیسٹ
کئے گئے اور انہیں دنیا جہاں کی بیماریاں بتائی گئیں۔
نرس کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ یہاں سیخالی کی
آڑ میں اور کچھ ہو رہا ہے۔ حقیقت کھلنے پہ اس نے
خاموشی سے جاب چھوڑ دی۔

اس نے اپنی ایک دوست سے اسپتال کے بارے
میں ذکر کیا۔ اتفاق سے اس دوست کی والدہ نے بھی
ہزاروں روپے لگا کر ڈاکٹر آفتاب سے علاج کروایا تھا۔
بات نکلتے نکلتے ایک صحافی تک پہنچ گئی۔ اس سے اس
محلہ نے ڈاکٹر آفتاب کے بارے میں کچھ شکایتیں کی

تھیں وہ بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا جہاں اسپتال
تھا۔
وہ صحافی اپنی ٹیم اور کیرامین کے ساتھ اسپتال پہنچ
گیا۔ وہاں ڈاکٹر آفتاب نے پہلے دھمکیاں دیں پھر
غڈے بلوائے پھر آخر میں رشوت کی پیشکش کی۔
لیکن اس نے یہ چونکا دینے والا سچ ایک اخبار کو دے
دیا۔

اپنی رپورٹ میں اس نے چشم کشا حقائق کا ذکر کیا۔
ڈاکٹر آفتاب نے اپنے تعلقات کام میں لانے چاہے مگر
بات بہت اوپر تک چلی گئی اور راز رسی کس دی گئی۔
ڈاکٹر آفتاب جیل میں ہے۔

عثمن علوی نے اخبارات اس کے سامنے رکھے
جس میں ڈاکٹر آفتاب کے کالے کرتوتوں کا ذکر تھا۔

"اور ہاں ڈاکٹر موصوف نری میں ڈاکٹر نہیں تھے
اسے ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی بنا پر
آری سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ کچھ عرصہ پاکستان سے
غائب رہا۔ واپس آیا تو ڈگریوں کی قطار اپنے نام کے
ساتھ لگائی تھی جو کہ ظاہر ہے جلی اور خوشامیڈ تھی
یہ ایک بات ماننے کی ہے جندہ بہت پیش نہیں آتی ہے
اتنے سال لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا۔
اس نے لوگوں کے سامنے اپنی ایک ہی شادی ظاہر کی
تھی ابھی بعد میں اس حقیقت کے بعد اس کی کئی
بیویاں سامنے آئی ہیں جو اس ایک سانپ کی ڈسی ہوئی
ہیں۔ سنا ہے اب ڈاکٹر آفتاب ایک کم عمر لڑکی سے
شادی کے چکر میں تھا۔ لڑکی بھی صاحب جائیداد اور
تعلیم یافتہ تھی ورنہ اس سے پہلے اس نے جتنی بھی
شادیاں کیں سب بیویاں واجبی تعلیمی منظر کی حامل
تھیں اس کی سکرٹری جو اس کی بیوی بھی ہے وہ نہیں
چاہتی تھی کہ ڈاکٹر اس لڑکی سے شادی کرے کیونکہ
اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر اس کو چھوڑ نہیں پائے گا۔ اس
نے دھمکی دی اگر ڈاکٹر نے اس لڑکی سے شادی کی تو وہ
سارا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ مجبوراً ڈاکٹر کو شادی سے
پہلے پیسوں کا مطالبہ کرنا پڑا اور وہ لڑکی بچ گئی۔ بہت بڑا
جھوٹا ہے یہ شخص۔ اتنا کافی ہے یا کچھ اور بھی بتاؤں

اس جلی ڈاکٹر کے بارے میں...؟" عثمان نے اس کی
دلچسپی محسوس کر لی تھی۔
"نہیں جو مجھے معلوم ہوا ہے وہ کافی ہے۔" ایک دوا
دبا جوش اس کے چہرے سے جھانک رہا تھا۔ عثمان سے
تمام اخبارات اس نے لے لیے۔
حوریہ کو سنانے کے لیے اس کے پاس بہت بڑی
خوش خبری تھی۔ جس ڈاکٹر آفتاب کی دھمکیوں سے
گھبرا کر اس نے اپنی نسوانی انا کو اوپر لگایا تھا اپنے مزاج
سے بہت کر بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا اب اس شخص سے
اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے انجام
کو پہنچ چکا تھا اور شاید اس کے ساتھ ساتھ ان کی
مجبوری کا رشتہ بھی۔
سوچتے ہوئے وہ معمول سے زیادہ افسردہ تھا۔

وہاں اسے سامنے پا کر بہت خوش ہوئے۔ وہ
ابھی ابھی گھر پہنچا تھا۔

چورسہ تیار ہو رہی تھی۔ ساتھ والے گاؤں میں
ملک کی حالت کے دوست کے پوتے کی مندی تھی
انہیں ادھر ہی جانا تھا۔ وہ کہیں آتی جانی نہیں تھی۔
وہاں جاننے ہی اسے ساتھ لے جانے پر راضی کیا تھا۔
اب شیراقلین آگیا تھا تو وہ اسے چھٹی ساتھ لے
جانے کو کہہ رہے تھے۔ وہ تیار ہو کر واداجہن کی طرف
آئی تو اسے خلاف توقع سامنے پا کر ٹھنک سی گئی۔
شیراقلین نے خود ہی خیریت دریافت کی۔

بلک کمر کی اوپن لانگ شرٹ اور جوڑی دار
پاسجائے میں ملبوس وہ بڑی نکھری نکھری سی نظر آ رہی
تھی۔ واداجہن نے شیراقلین کو بھی تیار ہونے کو کہا۔
وہاں پہنچنے کے بعد واداجہن تو تقریباً "گھنٹہ ہی وہاں
رکے اور پھر شیراقلین سے کہا کہ مجھے گھر چھوڑ آؤ۔
ابھی فنکشن چل رہا ہے۔ حوریہ کو بعد میں آکر لے
جانا۔ وہ انہیں گھر چھوڑ کر دوبارہ گیا۔ رات کافی زیادہ
ہو گئی تھی۔ حوریہ اس کے پیغام بھیجے جانے پہ باہر
آئی۔

وہ گاڑی کا اگلا دروازہ کھولے اسی کا منتظر تھا۔ وہ آگے بیٹھے ہوئے تھجک سی گئی۔

باہر رات کا خاموشی سناٹا اپنے اندر جانے کون کون سی داستانیں سمیٹے ہوئے تھے خاموشی سے آدا کر شیر افگن نے میوزک آن کر دیا۔ یہ تو طے تھا وہ اسے خود سے مخاطب کرنے والی نہیں تھی۔

تو ہی حقیقت خواب تو دریا تو ہی پیاں تو ہی دل کی بے قراری تو ہی سکوں ہم سفر تو ہم قدم تو ہم نوا میرا خاموشی کا طلسم بڑی سچائی بیان کر رہا تھا۔ یہ لڑکی اس کے دل میں چھپے خالص جذبات کو کیوں نہیں سمجھ رہی تھی۔ شیر افگن نے بھی کوئی بات نہیں کی۔

واوا جان سوچتے تھے اوپر پہنچ کر اس نے پہلے کپڑے بدلے پھر کھٹے بالوں کی چولی ہٹائی۔ بیکہ یا منتی پڑا کھل کھول کر اس نے جو کسی اور حجابا بہرینہ روم کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

”کون ہے؟“ وہ بند دروازے کے پاس جا کر آہستہ آواز میں بولی۔ الجھن میں تھی کہ کون ہے۔

”خوریہ! میں ہوں دروازہ کھولیں۔“ شیر افگن تھا۔ پہلے اس کے جی میں آئے نہ کھولے شاید وہ ایسے ویسے ارادے کی نیت سے آیا ہو مگر داغ نے اس کی یہ دلیل اسی وقت مسترد کر دی سو اس نے دروازہ کھول دیا۔

”یہ لیس کچھ نیوز پیپر ہیں“ آپ کے لیے خوشخبری ہے۔ صبح آپ سے تفصیل سے بات کروں گا۔“ وہ وہیں سے اخبارات اس کے ہاتھ میں تھما کر پلٹ گیا۔ وہ دروازہ لاک کر کے اندر آئی۔

اس اخبار میں اس کے لیے زندگی کی نوید تھی۔ اس نے اخبار کھولا۔ جلی حروف میں چونکا دینے والی سرخیاں تھیں۔

جعلی واکٹر آفتاب لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔ انسان کے روپ میں بھینسا۔

واکٹر آفتاب کا جعلی واکٹر بیٹا اسپتال میں کیا کرتا ہے۔

خوبرو لڑکیاں واکٹر آفتاب کے اسپتال میں کیا کرتی ہیں۔

ہو میو بیٹھک واکٹر نے کس قانون کی رو سے اپنے ہاسپٹل میں آپریشن ٹیبل پر بنا رکھا ہے وہ کون سا ایس لیس بی ہے جو اس کی ایک کال پہ پانچ منٹ میں آجاتا ہے۔ واکٹر آفتاب کے غنڈوں نے صحالی کو پیٹ ڈال دیا۔ رشوت کی پیشکش۔

واکٹر کی خوبو سیکرٹری چھ ماہ کے دوران ایک بار بھی گھر نہیں گئی کیوں؟ ان سارے جوابوں کی تفصیل اندرونی صفحات میں تھی۔

جوں جوں وہ پڑھتی گئی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا۔

اب تو اس کی آنکھوں سے نیند روٹھ گئی تھی۔ وہ بے چینی سے صبح کا انتظار کر رہی تھی کہ کب شیر افگن بیدار ہو جائے اور اس سے بات ہوئی ہے۔

پہلے ایک بار گئی میں آئی اس کے کمرے میں جا کر ابھی بات کر کے پھر خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیا۔

سرا کا چاند کھلی کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی بند کر لی چاہی تو ٹھٹھک گئی۔ باہر میسر پہ شیر افگن کھڑا تھا۔

”یہ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے کھڑکی بند کر کے پردے گرا دیے۔

بے آواز طریقے سے اس نے میسر کی سمت کھٹنے والا دروازہ کھولا۔ وہ مغرب دیوار پہ دیووں بازو ٹکائے آگے جھانک رہا تھا۔ آہٹ پہ اسے دیکھ کر ہونکا۔

”آپ بھی جاگ رہی ہیں۔“ خوریہ کو اس کی آواز معمول سے زیادہ بھاری اور گہری سی محسوس ہوئی جس سے ایک اضطراب اور بے کلمی سی جھانک رہی تھی۔

”مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔“ اس سے قدرت فاصلے پہ وہ بھی رنگ پہ بازو ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

”تمہاری نیند نہ آنے کی وجہ مجھے پتا ہے۔“ وہ دل میں سوچ رہی تھی۔

”واوا جان کل لاہور جا رہے ہیں۔“ شیر افگن نے بے تاثر لہجے میں بتایا۔

”کیوں؟“

”میرا نرسفر اسلام آباد میں ہو گیا ہے سو وہ چھوٹے چچا کے پاس جا رہے ہیں۔“ اس نے اب سگریٹ سلگا لیا تھا۔

اس ٹھنڈ میں بھی وہ بلکی سی ٹائٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا، خوریہ کو اسے دیکھ کر خود سردی لگنے لگی۔

”آپ جا کر سو جائیں، مطمئن نہ سے کل بات ہوگی جو آپ کرنا چاہ رہی ہیں۔“ وہ سگریٹ کے لیے لے لے کر کش لگا رہا تھا۔

خوریہ کو اپنی توہین سی محسوس ہوئی جیسے وہ اسے یہاں سے بھگنا چاہ رہا ہے۔ پھر اس نے کوئی بات نہیں کی کہ اپنے کمرے میں آئی۔

باہر شیر افگن میسر پہ پڑی کرسیوں میں سے ایک چھٹیت کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ سری پہ اس کی ٹانگیں دھری تھیں۔

واوا جان کل لاہور جا رہے تھے۔ اس نے اسلام آباد کے نرسفر گراہی بھی بواوا جان سمیت سب کو لے کر لے کر کہا تھا کہ وہ خوریہ کو اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔

شروع میں پریشانی تو ہوئی تھی سب کے سوالوں کا سامنا کرنا تھا۔ ماما کی ناراضی سنی تھی۔ کتنا حیران ہوں گے سب یہ سن کر کہ خوریہ اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے اس کی محبت من چاہی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے شادی کے محض چار ماہ بعد۔ بابا بابا۔ اس کے اندر کوئی ہنسا۔

ماما بابا واوا جان کو وہ کیسے حقیقت بتائے گا کہ وہ قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے۔ جس لڑکی کو وہ مظلوم دے بس اور لاچار سمجھا تھا۔ اسے سرے سے کسی تحفظ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسے عارضی طور پر ایک سارے کی ضرورت تھی اور اب اس کی ضرورت پوری ہو گئی ہے اور اس کا کوئی کردار بھی نہیں ہے اس ڈرائے میں۔ سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں غصے سے دھننے لگیں۔

واوا جان کو ذرا سیور لاہور چھوڑ آیا تھا۔

جانے سے پہلے خوریہ کے بارے میں انہوں نے شیر افگن کو ڈھیروں ہدایات دی تھیں۔ سن کر وہ دل میں خوب ہنسا۔

”واوا جان ان محترمہ کو ہماری محبت توجہ اور پیار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے دل میں تنفر سے سوچا۔

وہ بول رہا تھا اور خوریہ صرف سن رہی تھی۔ چپ چاپ بے حس و حرکت کسی بات کی طرح ساکت۔

واکٹر آفتاب کی تمام حقیقت آپ پر کھل گئی ہے، شکر کریں کہ اس شخص سے بچ گئی ہیں۔ خود کو وہ ناقابل تخیل تصور کرتا تھا مگر اس کا انجام آپ کے سامنے ہے، اب آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات اب آپ کے حق میں ہو چکے ہیں اور آپ مضبوط ہو کر اپنی جگہ پر کھڑے رہیں۔

آپ اس گھر سے اپنی مرضی سے جو بھی چاہیں لے جاسکتی ہیں۔ آپ بیکنگ کر بیچے گا اور جہاں بھی ہیں میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔ اور یہ دل سے نکال دیجیے کہ میں نے آپ پر احسان کیا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس کی بھی مدد کرتا۔

میں نے زور زبردستی سے آپ سے کوئی تعلق بنانے کی کوشش نہیں کی میں چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا کیونکہ سب اختیار آپ مجھے سونپ چکی تھیں۔ کہیں میں بہت خوش ہوں میرے لیے یہ احساس ہی سکون بخش ہے کہ میں نے آپ کو نکاح کے بعد سے لے کر آج تک چھوڑا بھی نہیں۔ اور آپ بھی خوش ہوں گی کہ جیسی یہاں آئی تھیں ویسے ہی جا رہی ہیں۔ آپ صاحب حیثیت ہیں۔ دولت مند ہیں۔ نئی زندگی شروع کر سکتی ہیں۔ ملائکہ کے پاس جاسکتی ہیں۔“

خوریہ نے دھواں دھواں ہوتے چہرے سمیت اس

کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے تو یہ بات اس سے چھپا رکھی تھی پھر اسے کیسے پتہ چلی۔
وہ اس کی طرف دیکھ نہیں پاری تھی مبادا وہ اس کی آنکھوں میں پھینے والی نمی نہ دیکھ لے۔ جب سب کچھ طے تھا کہ ان کا ساتھ عارضی ہے تو پھر آج اس وقت اس کا دل ویران کیوں ہوا جا رہا تھا۔

جب اس نے سوچ رکھا تھا وہ یہاں سے جانے کے لیے آئی ہے تو پھر یہ دکھ یہ آنسو کیا معنی رکھتے ہیں۔
”آپ پریشان مت ہوں۔ آپ کے پاس زندگی کو آسان کرنے کے لیے بہت سی مادی وسائل ہیں اور آپ ہر شخص کو لالچی سمجھنا چھوڑ دیں، کیونکہ ہر کوئی ڈاکٹر آفتاب نہیں ہوتا۔“

شیرافگن اس کے بعد زکام نہیں گھر سے نکل گیا۔
حوریہ خود کو یقین دلارہی تھی کہ اس نے جو کچھ سنا ہے وہ سچ ہے۔ شیرافگن ہی سب کچھ کہہ کر گیا ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس کے لیوں پر زخمی سی مسکراہٹ آئی۔

تمہارے ساتھ بھی تھی بے سکونی
تمہارے بعد بھی اک بے نگلی ہے
ڈٹے ہیں اپنی ضد پہ دونوں
اتار دیوار سی رو میں کھڑی ہے
حوریہ اپنے کپڑے اور دیگر چیزیں رکھ رہی تھی۔
شیرافگن نے دروازے سے ہی جھانک کر اس کی سرگرمی ملاحظہ کی۔

وہ نارمل طریقے سے سب کچھ کر رہی تھی۔ گویا اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

اس گھر سے اس مطلبی و خود غرض لڑکی کو کتنی محبتیں کی تھیں۔ ماما اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگے تھے اسے عادل اور ایمان بڑی بہن کی طرح احترام دیتے تھے۔ اور دادا جان تو اسے دیکھ کر جیتے تھے گویا۔
شیرافگن جیسے لاڈلے پوتے کی بیوی ہونے کے ناتے ان کا رویہ اور محبت خصوصی رہی تھی۔

کسی بات کو تو وہ سوچ لیتی۔ اور شاید وہ ڈاکٹر آفتاب کی طرح اسے بھی لالچی سمجھ رہی تھی۔ شیرافگن کو سب کچھ گوارا تھا مگر اس کی ذات کو کوئی نشانہ بنائے یہ کسی حال میں وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

شیرافگن گاڑی اشارٹ کرچکا تھا۔ حوریہ نے آخری نظر ان در و دیوار پر ڈالی۔ اسے وہ دن یاد آیا جب بچہ لوں کی پیتیاں بچاؤ کر تے ہوئے اس کا دلہانہ استقبال ہوا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے میڑھیاں اتر رہی تھی۔ ہر میڑھی پہ رکتی اور پھر پلٹ کر دیکھتا۔ پھر وہ نیچے آئی۔ پر آمدے میں دادا جان کی چیخ رانی مخصوص جگہ پر ہی تھی۔ شدت ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ اسے یوں لگا اگر ایک منٹ بھی یہاں کھڑی رہی تو غم کی شدت سے بکھر جائے گی، ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

تیز تیز قدموں سے اس نے طویل برآمدہ اور صحن عبور کر کے گاڑی تک کا سفر طے کیا۔ شیرافگن اسی سے انتظار میں تھا۔ اڑبڑی تھی، شیا، عبا اور اشکارف میں آنکھوں کے ہوا سارا جسم چھپائے ہمیشہ کی طرح براسرار اور دلکش لگ رہی تھی اسے۔ حوریہ کی آنکھیں اسے سرخ محسوس ہوئیں یا شاید اس کا وہم تھا وہ گرنے کے انداز میں سیٹ پر بیٹھی تھی۔
شیرافگن اسے اس کے گاؤں والے آبائی گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ جہاں اس نے جنم لے کر بچپن سے جوانی تک کا سنہرا دور گزارا تھا۔ اس نے خود درخواست کی تھی کہ مجھے وہاں چھوڑ آؤں۔ شیرافگن کو اس کے بچکانہ فیصلے پر اعتراض تھا مگر وہ کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔

حیدر بھائی کی طرف وہ جانا نہیں چاہتی تھی، اس لیے سنی سے انکار کر چکی تھی۔ ملائکہ کی طرف اتنی جلدی نہیں جاسکتی تھی۔ کانڈی کارروائیوں میں ہی سال چھ ماہ لگ جانے تھے۔ لے وے کے اس کے پاس مجاہد دلی

حویلی کا سارا ہی تھا۔
رات اس نے شیرا قلن سے کہا تھا ”آپ مجھ پہ
آخری احسان کر دیں مجھے وہاں چھوڑ آئیں۔“ اس
نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے نیچے کونے میں
غٹلیں کیس پہ اس کی نظر پڑی تھی۔ اس میں وہی
لاکٹ تھا جو شادی کی اولین رات شیرا قلن نے اسے
دیا تھا۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ لاکٹ
اس نے اپنے شوذر بیک میں احتیاط سے رکھا تھا۔

گاؤں قریب آتا جا رہا تھا۔ فاصلہ سمٹ رہا تھا۔ توں
توں حوریہ کو اپنے حواس کمزور پڑتے محسوس ہو رہے
تھے۔ گاڑی براؤن گیٹ کے آگے رُک چکی تھی۔ اس
کے قدموں نے اترنے سے انکار کر دیا۔

”آپ کی منزل آچکی ہے مجھے اجازت دے۔ میں
بہت جلد اپنے وکیل سے طلاق کے پیپر تیار کروا کر
سائن کروں گا۔ پھر آپ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں
گی۔“ وہ اس کا بیگ نکال کر گاڑی کی وکی سے باہر نکلا
چکا تھا۔

حوریہ نے بمشکل تمام گھسیٹ کر خود کو باہر نکالا۔ وہ
دوبارہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی اشارت ہی نہیں ہو
رہی تھی۔

حوریہ دنیا مالاہیا سے بے خبر اسے دیکھے جا رہی
تھی۔ بلیو جینز، بلیو لائٹنگ والی شرٹ میں ملبوس اپنی
ڈارک براؤن چمکی آنکھوں کو ڈارک گلاسز کے پیچھے
چھپائے ہلکی ہلکی دائرہ صی میں بالوں کے شارٹ کٹ
اسارٹ اشارت میں وہ اسے اپنی دسترس سے ہمیشہ کے
لیے دور جاتا لگ رہا تھا۔

تیسری کوشش میں گاڑی اشارت ہو گئی۔ ان چند
ثانیوں میں وہ اپنی آنکھوں سے گویا اس کا ایک ایک
نقش حفظ کر چکی تھی۔ زن سے گاڑی دوڑا تا وہ اس
کے پاس سے گزر گیا۔

حوریہ کا جی چاہا اسے آواز دے کر روک لے کہ

مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا
تھا۔ فقط دھول لہرائی رہ گئی تھی۔ جس میں ارد گرد کے
منظر دھندلا رہے تھے۔

گاؤں کے آس پاس کے گھروں کی عورتیں باہر نکل
آئی تھیں۔ اتنے برسوں کے بعد اس کی آمد حیرت انگیز
تھی۔ وقت کافی گزر چکا تھا اسے یہاں سے گئے مگر پھر
بھی اس کی پہچان کے نقوش مدہم نہیں پڑے تھے۔
اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

حیدر بھائی نے حویلی کی دیکھ بھال کے لیے جن
میاں بیوی کو رکھا تھا وہ بھاگے بھاگے آئے۔ اس دیکھ بھال
کا انہیں معقول معاوضہ ملتا تھا اس لیے تابعداری
میں پیش پیش تھے۔

آپنی پڑوس کی اور عورتیں بھی اس کے پاس جمع
ہو گئی تھیں۔ جن کے پاس طرح طرح کے سوال تھے۔
بہت سی آنکھوں نے اسے ایک جاذب نظر نوجوان
کے ہمراہ گاڑی سے اترتے دیکھا تھا۔ جو اسے اتارنے
کے بعد واپس چلا گیا تھا اس کے بارے میں جاننے کا
جتنی شہسوار نہیں تھیں حوریہ کی اگلی کسی سوال کا

جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔

حوریہ شکل سے ہی ہراساں اور پریشان لگ رہی
تھی۔ چاچی فریدہ کو لگ رہا تھا دال میں کچھ کالا ہے۔
اتنے سالوں کے بعد اس کی ایک اجنبی کے ہمراہ ایسی
خالی از غلت نہیں تھی۔

”آج رات ادھر ہی سو جاؤ۔ صبح اپنے گھر چل جانا خیر
سے“ اس نے خاموشی سے سر اثبات میں ہلادیا۔

شکر تھا کہ چاچی فریدہ نے اس کے بعد کوئی سوال
نہیں کیا۔ حد سے زیادہ تھک گئی تھی وہ لیکن میند پڑی
در کے بعد آئی جب وہ جاگ جاگ کر بے حال ہو چکی
تھی۔

دوسرے دن وہ اپنی حویلی میں آگئی۔
سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی کمرے ویسا ہی گول

ستونوں والا برآمدہ وہی مل کھاتی سیڑھیاں وہی اپنائیت
بھری فضا سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔

بابا جان کے کمرے میں جا کر اس نے ایک ایک چیز
کو چھو کر دیکھا۔ پھر اپنے کمرے میں آئی جہاں اماں
فاطمہ اس کے ساتھ سویا کرتی تھیں۔

رومینہ اور انور کے لیے وہ اجنبی تھی۔ لیکن مانکن
ہونے کے ناتے وہ اس سے اپنائیت ہی محسوس کر
رہے تھے۔ بہت خاموش مہم عم اور اس کی لگ رہی
تھی مانکن۔ خاصی بے ضرر۔ دوسرے کھانے کا
انہوں نے پوچھا کہ کیا بنایا جائے تو اس نے کہا جو مرضی
ہو۔

حوریہ نے دوسرے کھانا بھی نہیں کھایا اور کمرے
میں پھنسی رہی۔ رومینہ کھانے کا کینے آئی تو اس نے اندر سے
ای کہہ دیا بھوک نہیں ہے۔

شام ہو گئی مگر اس کے کمرے کا دروازہ بند ہی رہا۔
رومینہ سے رہا نہیں گیا اور اس نے دستک دے
ڈال۔ تیسری دستک۔ حوریہ نے دروازہ کھول دیا۔

”مجھے ایک کپ چائے بنا دو۔“ اس سے پہلے کہ
رومینہ کوئی سوال کرتی حوریہ حکم دے کر دوبارہ اندر
چلی گئی۔

رومینہ کے ذہن میں بہت سے سوال آ رہے تھے
لیکن جواب معلوم کرنے کی جرات سر حال اس میں
نہیں تھی۔

رات کو بڑا تیز طوفان آیا۔ رومینہ اور انور سارے
دروازے بند کر کے کب کے اپنے کمرے میں جا چکے
تھے۔

حوریہ سارا دن وقفے وقفے سے روتی رہی۔ دن کو
کھانا کھایا ہی نہیں گیا رات اس نے چند نوالے زہر مار
کیے۔ اب وہ دروازہ بند کیے بیٹی تھی جب تیز چلنے والی
ہوا ایک ہی آنڈھی اور طوفان میں بدل گئی۔ باہر تیز

ہوا کی شامیں شامیں اور بادلوں کی گزر گزراہٹ تھی۔
بجلی رورہ کر چمک رہی تھی۔ درختوں کے سائے کھڑکی
کی طرف جھٹکے تھے۔ بجلی کے چمکنے سے سارا ماحول
ایک ڈنڈے کے لیے منور ہو جاتا اسے یوں لگا جیسے کھڑکی
کے باہر بہت سی ٹاؤن ہلکے سے دیکھ رہی ہیں۔

بے اختیار جھپٹا کر اس نے رومینہ اور انور کو آواز میں
دیں مگر اس قیامت کے شور میں ان تک حوریہ کی کوئی
بھی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ زور زور سے رونے
لگی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی بھی خوف نے اس کے دل
دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

”شیرا قلن! کہاں ہو! پلیز آجاؤ میری مدد کرو۔“ اس
کا نام سسکاری کے ساتھ اس کے لبوں سے برآمد
ہوا۔ جیسے وہ پاس ہو اور سن رہا ہو۔

خوف سے بے حال ہوتے ہوتے اس کے حواس
ہی ساتھ چھوڑ گئے۔

حیدر، حنان، عافیہ اور مناشا چاروں اس کے گرد
خطرے پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ صبح رومینہ نے
کتنی بار حوریہ کے دروازے پر دستک دی مگر اندر سے
کوئی جواب نہیں ملا وہ انور کو بلا لائی۔ دونوں برابر
دستک دے کر اسے بلاتے رہے۔ پندرہ منٹ کے بعد
رومینہ چاچی فریدہ کو بلا لائی۔ باہمی مشورے کے بعد
دروازہ توڑ دیا گیا۔ اندر حوریہ بے ہوش پڑی تھی۔
اس کے ماتھے پر خون جما ہوا تھا۔ شاید وہ کسی چیز
سے ٹکرائی تھی نہیں آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

اس دوران انور چاچی فریدہ کے شوہر اور ایک پڑوسی
کی مدد سے حوریہ کو گاڑی میں ڈال کر گاؤں کے سب
سے مستند ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔ حوریہ کو اس نے
ابتدائی طبی انداز دے دی تھی۔ اور گھوکوز بھی لگا دیا
تھا۔ خطرے یا پریشانی والی بات نہیں تھی۔ انور نے
حیدر کو فون کر دیا تھا۔

وہ خوف اور کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہوئی تھی
اور بی پی بھی خطرناک حد تک اوہو رہا تھا۔ ان چاروں

کے آنے تک اسے کچھ کچھ ہوش آنے لگا تھا۔
ڈاکٹر نے دوائیں دے کر سب ٹھیک سے کا اشارہ کیا
تو وہ اسے لے کر گھر آگئے۔ ابھی ابھی اس کی آنکھیں
نہیں کھل رہی تھیں۔ بلکہ وہ منوں بوجھ دھرا
محسوس ہو رہا تھا۔

انور اور روینہ کو جو کچھ معلوم تھا حیدر کو بتا چکے
تھے۔ اس سے زیادہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کی
آمد پر چاچی فریدہ بھی آئیں۔ یہ انہیں بھی پتہ تھا
کہ ایک سانولا خوش شکل چھوٹی چھوٹی دائری والی
اونچا لمبا نوجوان گاڑی میں یہاں تک حوریہ کو چھوڑ کر
گیا تھا لیکن وہ کون تھا چاچی فریدہ کو نہیں پتہ تھا۔
ان سب کو معلوم ہو گیا کہ وہ شیراقلین کے سوا کوئی
نہیں ہو سکتا۔ جلد سو فیصد اسی کا تھا۔ عافیہ نے حیدر
سے کہا کہ ابھی فون کر کے اس سے پوچھو کہ حوریہ کو
یہاں اکیلا کیوں چھوڑ کر گیا۔ وہ کافی غصے میں تھی اور
حیدر کے ساتھ حنان کو بھی تاؤ دلاسنے کی کوشش کر
رہی تھی۔ حنان نے حیدر سے کہا کہ پہلے حوریہ سے
اصل بات معلوم کرتے ہیں اس کے بعد شیراقلین
سے بات ہوگی۔

جہاں تک حنان کو اس کے بارے میں علم تھا وہ
حساس، رحم دل اور محبت کرنے والا شخص تھا۔ بقول
عافیہ بھابھی کے اس نے حوریہ سے ظلم کیا اور یہاں
پھینک گیا لیکن وہ اس بات سے متفق نہیں تھا۔ وہ اعلا
تعلیم یافتہ اور مہذب کردار کا لڑکا تھا، اس طرح کی
حرکت کی توقع اس سے رکھی ہی نہیں جاسکتی تھی۔
حنان نے عافیہ اور شیراقلین کو منع کر دیا کہ فی الحال
حوریہ سے کوئی سوال نہ کیا جائے۔ اسے ساتھ لے کر
وہلا ہو رہا پس آگئے۔

گھر پہنچتے ہی حنان نے شیراقلین کو فون کیا۔ وہ
فی الحال چکوال میں تھا۔ آواز سے اس کی طبیعت ٹھیک
نہیں لگ رہی تھی۔
”حوریہ سے تو بات کراؤ میری۔ ذرا حلال احوال

پوچھوں۔ شادی کے بعد ایک بار کے علاوہ وہ ادھر آئی
ہی نہیں۔ ذرا کلاس تولوں اس کی۔“ حنان نے اپنے
انداز سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسے حوریہ کی
موجودگی کا علم ہے اور یہ کہ اس وقت وہ گاؤں
میں نہیں بلکہ اس کے پاس ہے۔

اس کے سوال پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔
خاصی دیر بعد وہ بڑی مشکل سے بولا۔
”حوریہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔“
”تو کہاں ہے؟“ اس نے اپنے اندرونی غصے پر
بمشکل قابو پایا۔

”وہ اس وقت اپنے گاؤں والی حویلی میں ہوں گی اور
ان کے کہنے پر میں نے انہیں وہاں ڈراپ کیا تھا۔“ وہ
آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔
”کیوں تم نے حوریہ کو وہاں اکیلا چھوڑا؟“ اب کی
بار اس کا غصہ ظاہر ہو ہی گیا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ میں نے ان کی خواہش سے سب
کچھ کیا ہے تو تم یقین کر لو گے میرا؟“ اس کے قہقہے میں
کچھ ایسا سرور تھا کہ حنان کا غصہ بھینک کی طرح بج
گیا۔

پھر شیراقلین نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ کتنی دیر
حنان خاموش رہا۔
”میں اس سے بات کرتا ہوں کہ اس نے یہ سب
کیوں کیا اس کے بعد اس کا حل سوچیں گے اور تمہارا جان
یا کسی اور سے مت کہنا۔“

حنان نے کیا کہنا ہے۔ اس وقت سے پریشان ہوں
جب سے پوچھیں گے حوریہ کہاں گئی تو میں کیا جواب
دوں گا۔“ حنان کو اس کی بات پر پیار سا آگیا۔
حوریہ مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔
حنان عافیہ بھابھی کے بارے میں سوچ سوچ کر متغیر ہو
رہا تھا۔ حوریہ کے ذہن کو زہر آلود کرنے والی یہی
تھیں۔ اس کے اس فیصلے کا محرک یہی تھیں۔

”تم گھر میں مجھ سے حیدر بھائی سے ذکر کر سکتی
تھیں۔“ خاصی دیر بعد وہ بولا اب وہ اسے نگاہیں نہیں
مارا تھا۔

پہلے وہ اس پر خاصی گرجا برسا خوب کھری کھری
تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اسے اتنا شدید غصہ آیا
تھا۔ حوریہ خائف سی ہو کر بول ہی پڑی وہ سب کچھ
بتاتی گئی جو عافیہ بھابھی وقتاً فوقتاً ”ہمدردی کی آڑ میں
لے کتی آتی تھیں جب اس نے یہ کہا کہ عافیہ بھابھی
ہانے پورے یقین سے یہ کہا تھا کہ تمہیں کوئی اچھے
گھر لانے کا رشتہ نہیں ملے گا۔ نہ ہی کوئی کنوارا لڑکا
تمہیں اپنی بیوی بنانا پسند کرے گا تو اس بات پر حنان کا
دل چاہا اپنے سر کے بال نوج لے۔

”یہ یقین لڑکی! تم جن باتوں سے ڈرتی رہیں وہ تو
شادی سے پہلے ہی حیدر بھائی اور میں نے شیراقلین
کو بتادی تھیں۔ اور اس نے اپنی مہمان کو پاکستان
چھوڑنے سے پہلے تمہارے ساتھ ہونے والی ٹرچڈی
سے آگاہ کر دیا تھا۔ جن باتوں کی ان کے نزدیک اہمیت
نہیں تھیں تمہارا خواہ مخواہ انہیں سر پر سوار کئے رہیں۔ اور تم
اب کوئی مزید حماقت نہیں کرو گی۔ شیراقلین آ رہا ہے۔
شکر کا مقام ہے اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ میرے کہنے
پر منت سماجت کر رہے ہیں کیا ہے؟ تمہیں انداز ہے کہ
چاہے اس کی محبت کی۔ ایسے لوگ تو قسمت والوں کو
ملتے ہیں۔“

حنان جاچکا تھا وہ تو اسی ایک جیلے کے حصار میں قید
تھی کہ وہ آ رہا ہے۔

عافیہ نے بڑی حیرت سے حوریہ کی سرگرمیوں کو
دیکھا۔
تین دن کے بعد وہ آج کمرے سے نکلی تھی۔ بہت
خوبصورت جوڑا زیب تن کے بال سنوارے بات بات
مسکراتے نب۔ کتنی انوکھی اور مختلف لگ رہی
تھی۔ ورنہ جس حوریہ سے عافیہ واقف تھی وہ دو بزدل
اور چھوٹے سے دل کی مالک احساس کمتری کا شکار لڑکی
تھی۔

”کیا بات ہے بہت خوش ہو جن۔ ورنہ جب سے
ہم تم کو گاؤں سے لے کر آئے تھے تمہیں جو میں گھنٹے کرا

بند کیے پڑی تھیں۔“ اس کی نظر اندر تک اتر جانے
والی تھی۔
”بھابھی! شیراقلین آ رہے ہیں ناں۔ رات کو ان کا
فون آیا تھا کہ تیار رہنا آج میں تمہیں لے جاؤں گا۔“
حوریہ کے لبوں پر خوبصورت مسکان بجی تھی۔

ہمیشہ سے سادہ اور عام سے جیلے میں رہنے والی
حوریہ اس وقت بہت پرکشش لگ رہی تھی۔
”تم گاؤں کیوں گئی تھیں اور تمہیں وہ اکیلا کیوں
چھوڑ آیا تھا وہاں؟“ اس ایک سوال کا جواب حاصل
کرنے کی خاطر وہ مری جا رہی تھی۔

”میں نے ہی ضد کی تھی کہ میں اکیلے کچھ دن گاؤں
میں گزارنا چاہتی ہوں۔ میری ضد کے آگے وہ مجبور
ہو گئے تھے ورنہ یہاں بھی نہیں رہنے دیتے کرات نہیں
رکنے دے گا۔“ اس نے بڑے دھڑلے سے جھوٹ
بولی۔ عافیہ کا چہرہ اتر سا گیا۔

وہ توقع کر رہی تھی کہ کوئی جھٹ پٹی سی کہانی ہوگی
مسا لے دار واقعہ ہوگا مگر یہاں تو کھودا پہاڑ نکلا چوہا والا
معاذ شکر! وہ تو انہیں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لینا ہوا تھا۔
نہ شاہا ہر گھر کے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔

حوریہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے دل پر
بوجھ سا آکر اٹھا۔ امی حوریہ سے بہت پیار کرتی تھیں۔
ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ بھی اعتراض نہیں تھا۔ مگر امی
کے مرتے ہی بھابھی نے اس کی سوچوں کو یکسر بدل ڈالا
تھا۔ اس کی زندگی میں حوریہ بہت پیچھے بہت ہی دور رہ
گئی۔ شادی ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ کبھی
کبھی بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا۔ بڑی خاموشی سے اس کی
آنکھوں سے ابھی ابھی ایک آنسو نکلا تھا۔

شیراقلین آ رہا تھا۔ اس کے بعد اسے کئی امید تھی
کہ حوریہ وہ سب پالے گی جس کے خواب دیکھتی آئی
تھی۔

اس نے شیراقلین کے لہجے میں حوریہ کے لیے
پریشان دیکھی تھی۔ اور حوریہ کی آنکھیں بھی اس کی
آمد کا سن کر دمک اٹھیں۔

”خوریہ ہمیشہ خوش رہے میرے اللہ!“ اس نے صدفِ دل سے دعا کی۔ اب اس کا دل شانت تھا۔ اس کی ٹیکوں پہ ان کا پانی کا نمکین قطرہ ہنس رہا تھا۔

شیراقلن ڈانٹکٹ ٹیبل پہ نہیں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ خوریہ سے تو کھانا ہی نہیں کھایا جا رہا تھا۔

یہاں آکر اس نے پرانی باتوں کو نہیں پھیرا تھا۔ بس حیدر بھائی سے کہا کہ میں خوریہ کو لینے آیا ہوں۔ واپسی کے لیے اس نے جہاز میں دو سیٹیں ریزرو کروائی تھیں۔ وہ خوریہ کے ساتھ اسلام آباد جا رہا تھا۔

ایر پورٹ سے باہر ڈرائیور ان ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ پورے راستے میں شیراقلن نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ خوریہ کی تو ہمت ہی نہیں بڑھ رہی تھی اسے مخاطب کرنے کی۔ گاڑی میں بھی ڈرائیور کی موجودگی میں اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی منزل آپجی تھی۔

ڈرائیور سلام کر کے چلا گیا۔ اب خوریہ وہاں اکیلی کھڑی تھی۔ کیوں کہ شیراقلن اندر چلا گیا تھا۔ وہ اس سے بولا نہیں تھا نہ اسے اندر آنے کو کہا تھا۔ خوریہ کو یہ پتہ تھا وہ بہت زیادہ ناراض ہے۔ وہ اسے حق بجانب تصور کر رہی تھی۔

اپنی ذات پہ اس کا اعتماد بحال ہوا تھا تو وہاں اپنے جذبوں کی سچائی بھی اس پہ عیاں ہو گئی تھی۔ خوریہ اس کے کمرے کے بند دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ دستک کے لیے آگے بڑھا۔ اور پھر اس نے بڑے یقین کے ساتھ اپنی محبت کے دروازے پہ دستک دی۔

کبھی آؤ کہ ہم مل بیٹھ کر پوری کریں جو باتیں ادھوری رہ گئی ہیں
زبوں تک آتے آتے جم گئی ہیں
کہ جیسے برف باری میں
درختوں کے ہرے پتوں پہ جانناں
شیراقلن نے دروازہ کھول دیا۔ پتے چپاتے ہوئے اس نے قدم آگے بڑھائے۔

وہ بالوں میں برش کر رہا تھا۔ مڑ کر دوبارہ اپنے شغل

میں مصروف ہو گیا۔ خوریہ اس کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ سر جھکائے۔ اس کی طرف دیکھنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ کیونکہ اب اس کی نگاہیں خوریہ پہ ہی مرکوز تھیں۔

”آپ ایسی لڑکی کو معاف کر سکتے ہیں جس کا اعتبار ہر رشتے سے اٹھ چکا ہو جو اپنی کم مائیگی سے ڈرتی ہو۔ کیونکہ جس کی رفاقت کے وہ خواب دیکھتی ہے وہ آسمان ہے اور وہ خود زمین ہے۔ وہ اپنے ہی جذباتوں کی تپش سے پھل رہی ہو، قطرہ قطرہ موم بن کر۔ بتائیے آپ ایسی لڑکی کو معاف کر سکتے ہیں۔“ خوریہ کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ اسے قابو نہیں رہا تھا۔

شیراقلن نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھا۔ اگلے ہی لمحہ وہ اس کے مضبوط حصار میں تھی۔

”جسے وہ آسمان کہہ رہی ہے وہ خود بھی تو پگھل رہا ہے۔ اور تم تو اس کی پیاس کے لیے دریا ہو۔“

خوریہ نے اپنی حیران آنکھیں اٹھا میں سر زیادہ دیر اس کی جذباتوں کی پورش سے تپتی آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی اور پگھلنے کی جگہ نہ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو کر یہاں کوئی معافی نہیں ہے۔ اس کی گستاخ نگاہیں صاف طور پر پیغام دے رہی تھیں۔

”پیارے! میں نے خود بہت جبر کیا اب تمہاری سزا شروع ہو گئی دکھتا ہوں تمنا برداشت کرتی ہو۔“ اس کے چہرہ جھکانے پر وہ بہت ہنسنا۔

شیراقلن نے اسے شرمندہ نہیں کیا تھا۔ اس کے جذباتوں کو پذیرائی بخش دی تھی اور اس سے وہ سنی خوش تھی۔ کوئی اس کے دل سے پوچھتا جو محبت کی خوبصورت نال پہ دھڑک رہا تھا۔

سوئے میں اس کے چہرے پہ الٹی سی مسکان تھی ہوئی تھی۔ شیراقلن نے اسے محبت کا اعتبار دے کر چاہت کے خوبصورت رنگوں سے سجایا تھا۔

وہ رنگ جو کبھی نہ مٹنے والے تھے۔ پتے اور پتے رنگ محبت کے خالص رنگ۔

اب خوریہ کو کوئی بے رنگ نہیں کہہ سکتا تھا۔